جاوید احمد غامدی

تقسیم وراثت

تقسیم وراثت کا قانون قرآن مجید کی سورۂ نساء (۴) میں بیان ہوا ہے۔ یہ قانون جہاں مذکور ہے، وہیں اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کو ہمیشہ کے عذاب کی وعید سنائی ہے جو اس قانون کو تبدیل کریں یا جانتے بوجھتے اِس کی خلاف ورزی کی جسارت کریں۔ یہ وعید اگرچہ اُن سب حدود الٰہی کے بارے میں ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں واضح طور پر مقرر کر دی ہیں، لیکن تقسیم وراثت کا ضابطہ بیان کرنے کے فوراً بعد اِس کا ذکر بتاتا ہے کہ خاص اِس ضابطے کی خلاف ورزی لوگوں کے لیے کس قدر سنگین نتائج کا باعث بن سکتی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ، وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا، وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ. وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ، يُدْخِلْهُ نَارًا، خَالِدًا فِيْهَا، وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ. (النساء۴: ۱۳-۱۴)

’’یہ اللہ کی ٹھیرائی ہوئی حدیں ہیں، (اِن سے آگے نہ بڑھو) اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ اور اُس کے رسول کی فرماں برداری کریں گے، اُنھیں وہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کریں گے اور اُس کی ٹھیرائی ہوئی حدوں سے آگے بڑھیں گے، اُنھیں ایسی آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اُن کے لیے رسوا کر دینے والی سزا ہے۔‘‘

یہ وعید اِس قدر سخت ہے کہ آدمی آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو اِس کو پڑھ کر کانپ جاتا ہے، لیکن انتہائی افسوس سے

کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان بالکل یہودیوں کی سی جسارت کے ساتھ خدا کے اِس قانون کو بدلتے بھی ہیں اور عملاً اِس کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اِس معاملے میں جو نافرمانیاں ہوتی ہیں، وہ خدا کے خلاف کھلی بغاوت کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ عورتوں کو میراث سے محروم کرتے ہیں۔ یہ قانون اگر کسی جگہ ریاست کی سطح پر نافذ ہے تو عدالتوں کی گرفت سے بچنے کے لیے بالکل ناجائز طریقوں سے دباؤ ڈال کر اُن سے دست برداری کی دستاویزات لکھواتے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کا حصہ جہاں برابر نہیں ہے، اُسے برابر کر دینے کی جسارت کرتے ہیں۔ صرف بڑے بیٹے کو میراث کا مستحق ٹھیراتے ہیں۔ دیہات میں بالخصوص مشترک خاندانی جائداد کا طریقہ اختیار کر لینے پر اصرار کرتے ہیں۔ یتیموں کا حصہ کھا جانے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہر وہ کام کرتے ہیں جسے خدا کے قانون سے کھلی بغاوت ہی کہا جا سکتا ہے۔

یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ اُنھیں مسجدوں سے متنبہ کیا جائے، منبروں سے پکارا جائے، ریڈیو، ٹیلیویژن اور اخبارات کے ذریعے سے بار بار توجہ دلائی جائے، تعلیم و تربیت کے اداروں میں درس دیا جائیق کہ دنیا کی زندگی اور اُس کا مال و منال ایک متاع غرور ہے۔ روز قیامت خدا کی بادشاہی میں حصہ پانے کے بجاے یہ تم کس چیز کا انتخاب کر رہے ہو۔ قرآن کے الفاظ میں گویا اپنے پیٹ میں انگارے بھر رہے ہو۔ اُنھیں بتایا جائے کہ ہمیشہ کی دوزخ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ اُس سے بچو اور اپنی میراث پوری دیانت داری کے ساتھ ٹھیک اُس قانون کے مطابق تقسیم کرو جو اللہ نے اِس باب میں مقرر کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی شخص نے بالشت برابر زمین پر بھی ناجائز قبضہ کیا تو قیامت میں اُس کو طوق بنا کر اُس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔*

تقسیم وراثت کا یہ قانون کیا ہے؟ اِس کی تفصیلات ہم نے اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کر دی ہیں۔ یہاں محض یاد دہانی کے لیے اُس کا خلاصہ چند نکات کی صورت میں بیان کیے دیتے ہیں۔

۱۔ مرنے والے کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے اُس کے ترکے میں سے وہ ادا کیا جائے گا۔ پھر کوئی وصیت اگر اُس نے کی ہو تو وہ پوری کی جائے گی۔ اِس کے بعد وراثت تقسیم ہو گی۔

۲۔ وارث کے حق میں وصیت نہیں ہو سکتی، الّا یہ کہ اُس کے حالات یا اُس کی کوئی خدمت یا ضرورت کسی خاص صورت حال میں اِس کا تقاضا کرے۔

۳۔ والدین اور بیوی یا شوہر کا حصہ دینے کے بعد ترکے کی وارث میت کی اولاد ہے۔ مرنے والے نے کوئی لڑکا

---

* بخاری، رقم ۳۱۹۸۔ مسلم، رقم ۴۱۳۳۔

نہ چھوڑا ہو اور اُس کی اولاد میں دو یا دو سے زائد لڑکیاں ہی ہوں تو اُنھیں بچے ہوئے ترکے کا دو تہائی دیا جائے گا۔ ایک ہی لڑکی ہو تو وہ اُس کے نصف کی حق دار ہوگی۔ میت کی اولاد میں صرف لڑکے ہی ہوں تو یہ سارا مال اُن میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اولاد میں لڑکے لڑکیاں، دونوں ہوں تو ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا اور اِس صورت میں بھی سارا مال اُنھی میں تقسیم کیا جائے گا۔

۴۔ اولاد کی غیر موجودگی میں میت کے بھائی بہن اولاد کے قائم مقام ہیں۔ والدین اور بیوی یا شوہر موجود ہوں تو اُن کا حصہ دینے کے بعد میت کے وارث یہی ہوں گے۔ ذکور واناث کے لیے اُن کے حصے اور اُن میں تقسیم وراثت کا طریقہ وہی ہے جو اولاد کے لیے اوپر بیان ہوا ہے۔

۵۔ میت کے اولاد ہو یا اولاد نہ ہو اور بھائی بہن ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ دیا جائے گا۔ بھائی بہن بھی نہ ہوں اور تنہا والدین ہی میت کے وارث ہوں تو ترکے کا ایک تہائی ماں اور دو تہائی باپ کا حق ہے۔

۶۔ مرنے والا مرد ہو اور اُس کی اولاد ہو تو اُس کی بیوی کو ترکے کا آٹھواں حصہ ملے گا۔ اُس کے اولاد نہ ہو تو وہ ایک چوتھائی ترکے کی حق دار ہوگی۔ میت عورت ہو اور اُس کی اولاد نہ ہو تو نصف ترکہ اُس کے شوہر کا ہے اور اگر اُس کے اولاد ہو تو شوہر کو چوتھائی ترکہ ملے گا۔

۷۔ اِن وارثوں کی عدم موجودگی میں مرنے والا اگر چاہے تو کسی کو ترکے کا وارث بنا سکتا ہے۔ جس شخص کو وارث بنایا گیا ہو، وہ اگر رشتہ دار ہو اور اُس کا ایک بھائی یا بہن ہو تو چھٹا حصہ اور ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں تو ایک تہائی اُنھیں دینے کے بعد باقی ۵/۶ یا دو تہائی اُسے ملے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانعام

(۷)

(گذشتہ سے پیوستہ)

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِيۡمُ لِاَبِيۡهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصۡنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّىۡۤ اَرٰٮكَ وَقَوۡمَكَ فِىۡ
ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۷۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُرِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ مَلَـكُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلِيَكُوۡنَ
مِنَ الۡمُوۡقِنِيۡنَ ﴿۷۵﴾

اِنھیں ابراہیم کا واقعہ سناؤ[۹۵]، جب اُس نے اپنے باپ آزر[۹۶] سے کہا تھا: کیا تم بتوں کو معبود بنائے بیٹھے ہو؟ میں تو تمھیں اور تمھاری قوم کو بالکل گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔ ابراہیم کو ہم اِسی طرح زمین و آسمان کی بادشاہی کا مشاہدہ کراتے تھے[۹۷] تاکہ وہ اپنی قوم پر ہماری حجت قائم کرے اور خود بھی اُن لوگوں میں سے ہو جائے جو پورا یقین رکھنے والے ہوں[۹۸]۔ ۷۴-۷۵

۹۵؎ آگے دوسرے نبیوں کا بھی ذکر ہے، لیکن ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ خاص اہتمام کے ساتھ اِس لیے سنایا جا رہا ہے کہ بنی اسمٰعیل بھی اُنھیں اپنا خاندانی بزرگ اور مذہبی پیشوا مانتے تھے اور بنی اسرائیل بھی۔ پھر دونوں یہ دعویٰ بھی رکھتے تھے کہ جس دین پر وہ اِس وقت عمل پیرا ہیں، اُس کی وراثت اُنھوں نے سیدنا ابراہیم ہی سے پائی ہے۔

۹۶؎ یہود کے مذہبی لٹریچر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزر صرف بت پرست ہی نہیں، بت گر اور بت فروش بھی تھے۔ قرآن نے اپنے عام اسلوب کے خلاف اُن کے نام کی تصریح غالباً اِس لیے کی ہے کہ وہ اُس اختلاف کو

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیۡہِ الَّیۡلُ رَاٰ کَوۡکَبًا قَالَ ھٰذَا رَبِّیۡ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِیۡنَ ﴿۷۶﴾

چنانچہ[۹۹] (ایک دن) جب اُس پر رات طاری ہوئی تو اُس نے تارا دیکھا (اور لوگوں کو متوجہ دیکھ کر)

رفع کرنا چاہتا ہے جو یہود و نصاریٰ کے ہاں اِس نام کے بارے میں پایا جاتا ہے۔

۹۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'کَذٰلِکَ نُرِیۡۤ اِبۡرٰھِیۡمَ'۔ یہ دراصل 'کنا نری ابراھیم' ہے۔ عربی زبان کے عام اسلوب کے مطابق فعل ناقص حذف ہو گیا ہے۔ ملکوت الٰہی کا یہی مشاہدہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اُس دلیل و حجت کی طرف رہنمائی دی جو اُنھوں نے اپنی قوم پر قائم فرمائی۔ اُن کی اِس حجت کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ یہ جملہ اُسی کی تمہید ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اِس ملکوت الٰہی کا مشاہدہ اُس نظر سے کرتے تھے جو درختوں کے ایک ایک پتے، زمین کے ایک ایک ذرے اور آسمان کے ایک ایک تارے کو معرفت کردگار کا دفتر بنا دیتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''جہاں تک غور کرنے کا تعلق ہے، اِس ملکوت پر غور تو ایک سائنس دان بھی کرتا ہے، لیکن وہ سارا غور و فکر اپنی ذات یا اپنے محدود ماحول کو محور بنا کر کرتا ہے۔ اُس کی نگاہ صرف اپنے نفع عاجل پر ہوتی ہے۔ اِس وجہ سے وہ اُن حقائق تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا جو اُس کی نگاہ کو اُس کے مطلوب نفع عاجل سے ہٹا دیں۔ وہ چمن میں کھلے ہوئے گلاب کو اِس نگاہ سے دیکھتا ہے کہ اُس سے گل قند یا اِسی طرح کی کوئی اور چیز تیار ہو سکتی ہے جس سے فلاں فلاں فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اِس کے بعد وہ اِس چکر میں نہیں پڑتا کہ اُس پھول کے حسن و جمال، اُس کی رعنائی و دل کشی، اُس کی عطر بیزی و مشام نوازی میں اُس کے صانع کی قدرت، کاری گری، حکمت، رحمت اور ربوبیت کے جلوے دیکھنے کی کوشش کرے اور اِن جلووں سے بے خود ہو کر پھول سے گزر کر پھول کے پیدا کرنے والے کے جمال و کمال کے مشاہدے میں غرق ہو جائے:

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

حالاں کہ ایک صاحب نظر کے لیے پھول کا یہی پہلو زیادہ جاذب نظر ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر پھول سے مقصود صرف گل قند ہی ہوتا تو صرف اِس مقصد کے لیے اُس کی ایک ایک پنکھڑی پر قدرت کو اِس فیاضی کے ساتھ گل کاری کی کیا ضرورت تھی؟ یہ گل کاری اور صنعت گری تو اِسی لیے فرمائی گئی ہے کہ پھول کی ایک ایک پتی معرفت کردگار کے دفتر کا کام دے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۹۰)

۹۸؎ اِس جملے کا معطوف علیہ اصل میں محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔ آگے کی آیتوں میں 'تِلۡکَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَیۡنٰھَاۤ اِبۡرٰھِیۡمَ عَلٰی قَوۡمِہٖ' کے الفاظ سے اُس کا تعین ہو جاتا ہے۔ اِس میں جس یقین کا ذکر

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ ﴿۷۷﴾ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ

کہا: یہ میرا رب ہے۔ پھر (اِسی طرح کے ایک موقع پر) جب تارا ڈوب گیا تو اُس نے کہا: میں (خدائی کے لیے) اُن کو پسند نہیں کرسکتا جو ڈوب جاتے ہیں[۱۰۰]۔ پھر (ایک دن) چاند کو چمکتے دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے۔ لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو اُس نے کہا: اگر میرے پروردگار نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہو کر رہ جاؤں گا[۱۰۱]۔ پھر (ایک دن) سورج کو چمکتے دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے، یہ

ہے، وہ ایمان سے اوپر کا درجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...ایمان ایک عام چیز ہے جس کے لیے اگر فطرت سلیم ہو تو اندر کا وجدان بھی کافی ہوتا ہے، لیکن یقین فکر و نظر، تفکر و تدبر اور ملکوت الٰہی کے علم و مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے مراتب و مدارج کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ چنانچہ آگے 'نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ' میں اُسی کے مراتب عالیہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ یہی یقین جب ایمان کے اندر پیدا ہوتا ہے، تب اُس کا فیضان متعدی ہوتا ہے، یہاں تک کہ بسا اوقات اُس سے دشت و جبل گونج اٹھتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۹۲)

۹۹؎ یہاں سے آگے اب اُس حجت ابراہیمی کا بیان ہے جو آں جناب نے زمین و آسمان میں ملکوت الٰہی کے مشاہدے سے اخذ کر کے اپنی قوم کے سامنے پیش فرمائی۔ اِس میں بنائے استدلال یہ حقیقت ہے کہ جن چیزوں کو معبود سمجھ کر لوگ اُن کی پرستش کرتے ہیں، وہ سب محکوم و مقہور، اپنی تقدیر کے پابند اور اپنے خالق کے احکام و قوانین کے تحت مسخر ہیں۔ اُن میں سے کوئی چیز اِن احکام و قوانین سے سرمو انحراف نہیں کرسکتی۔

۱۰۰؎ اصل میں یہ بات کہنا مقصود تھی، لیکن ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے مزاج کی رعایت سے استدراج کا طریقہ اختیار فرمایا۔ چنانچہ کسی مجلس میں پہلے ایک دن خود اپنے آپ کو مخاطب کر کے وہ بات کہی جس سے اُن کی ستارہ پرست قوم کسی حد تک مطمئن ہوگئی کہ ہمارے معبودوں سے بے زار یہ شخص بھی اب شاید کچھ مان لینے پر آمادہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اپنی قوم کے کانوں میں یہ بات ڈال کر وہ کچھ دن خاموش رہے۔ پھر کسی دن صبح کے وقت جب تارے ڈوب گئے تو خود کلامی کے اُسی انداز میں دوسروں کو سناتے ہوئے اُنھوں نے فرمایا کہ میں ڈوب جانے والوں کو خدائی کے لیے پسند نہیں کرسکتا۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ طلوع کے بعد اِن ستاروں کے غروب کو بھی دیکھو۔ یہ اپنے

فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾

سب سے بڑا ہے[۱۰۲]۔ لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو اُس نے (اپنی قوم کو مخاطب کر کے) کہا: میری قوم کے لوگو، میں اُن سب سے بری ہوں جنھیں تم (خدا کے) شریک ٹھیراتے ہو۔ میں نے یک سو ہو کر اپنا رخ اُس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں[۱۰۳]۔ ۷۶-۷۹

وجود سے شہادت دے رہے ہیں کہ اِنھیں جس قانون کا پابند بنایا گیا ہے، اُس سے ذرہ برابر تجاوز نہیں کر سکتے۔ اِس لیے کوئی عاقل اِنھیں اپنا معبود کیسے بنا سکتا ہے؟ یہ منصب تو اُسی کے شایان شان ہے جو حی و قیوم اور قدیم و لایزال ہو۔

۱۰۱؎ اِس میں تعلیم کا قدم مزید آگے بڑھ گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہاں صرف اتنی ہی بات نہیں ظاہر ہوئی کہ ڈوبنے والے سزاوار عبادت نہیں، بلکہ یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ اِن ڈوبنے والوں کو معبود بنانا کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ نیز یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ یہ ضلالت کوئی معمولی چیز نہیں ہے، بلکہ بڑے حسرت و اندوہ کی چیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ ہدایت کا سرچشمہ صرف خدا ہے، وہ ہدایت نہ بخشے تو انسان ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اُس کے درپے ہو جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں حضرت ابراہیم نے چونکہ اپنے آپ سے کہیں، اِس وجہ سے سننے والوں میں سے جس کے کان میں پڑی ہوں گی، اُس کے لیے اِن سے چڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی، بلکہ جس کے اندر کچھ بھی غور و فکر کی صلاحیت رہی ہو گی، وہ اِس سوچ میں پڑ گیا ہو گا کہ ایک یہ شخص ہے جو طلب ہدایت میں اِس طرح بے قرار ہے اور ایک ہم ہیں کہ پتھر کی طرح اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۹۵)

۱۰۲؎ صاف واضح ہے کہ یہ بات اُنھوں نے طنز، تحقیر اور استہزا کے طور پر کہی ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ خاص مزاج ہے۔ دوسروں کو مشتعل کیے بغیر اپنی بات اُن تک پہنچانے کے لیے توریہ، استدراج اور پاکیزہ ظرافت کے یہ انداز وہ بالعموم اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی اسلوب اُس جملے میں بھی ہے جو بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد اُنھوں نے اپنی قوم کی پوچھ گچھ کے جواب میں فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... انبیا کے طریقۂ کار اور خطاب و استدلال میں استدراج، مزاح، طنز، توریہ اور تدریج وغیرہ کے انداز جو کہیں کہیں پائے جاتے ہیں، یہ سب انسانی فطرت کے مقتضیات پر مبنی ہیں۔ اِن میں سے ہر اسلوب کا ایک محل ہوتا ہے

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰنِ وَلَآ اَخَافُ مَا
تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا اَفَلَا

اُس کی قوم (اِس بات پر) اُس سے جھگڑنے لگی۔ اُس نے جواب دیا: کیا تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو، دراں حالیکہ اُس نے میری رہنمائی فرمائی ہے[۱۰۴]۔ میں اُن سے نہیں ڈرتا جنھیں تم اُس کا شریک ٹھیراتے ہو[۱۰۵]۔ ہاں، اگر میرا پروردگار ہی کچھ چاہے[۱۰۶]۔ میرے پروردگار کا علم ہر چیز کا احاطہ

اور ہر انداز اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ بسا اوقات ایک وقفہ جو بظاہر ٹھیراؤ ہوتا ہے، سفر کی ہزاروں منزلیں طے کرا دیتا ہے اور ایک دل آویز طنز جو بظاہر طنز ہوتا ہے، ہزاروں حجتوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۹۹)

۱۰۳؎ 'وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ' کے جو الفاظ آیت میں آئے ہیں، اُن میں 'لِلَّذِیْ' کا لام دلیل ہے کہ 'وَجَّهْتُ' کا لفظ یہاں 'اسلمت' کے مضمون پر بھی مشتمل ہے۔ قوم کو مخاطب کیے بغیر ایک تدریج کے ساتھ اپنی بات اُس کے کانوں میں ڈالنے کے بعد اب اُس کو مخاطب کر کے ابراہیم علیہ السلام نے براہ راست اپنے عقیدے کا اعلان فرمایا ہے۔ یہ درحقیقت اسلام اور توحید کی دعوت ہے جو اِس اسلوب میں پیش کی گئی ہے۔ اوپر جس یقین کا ذکر تھا، یہ اُسی یقین کا اظہار ہے۔ اِس کا ایک ایک لفظ بتا رہا ہے کہ یہ اعلان کس اذعان اور کس شدت احساس کے ساتھ کیا گیا ہے۔ غروب آفتاب سے جب اُن کے سب سے بڑے معبود کی حقیقت بھی واضح ہو گئی تو یہی موقع تھا کہ یہ دعوت اُن کے سامنے پیش کی جائے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، جن کی خدائی کی دلیل اُن کے وقتی کروفر ہی سے اخذ کی گئی ہو، اُن کی بے ثباتی اور ناپائداری پر سب سے موثر تقریر کا وقت وہی ہوتا ہے، جب اُن کی لاش اُن کے پرستاروں کے سامنے پڑی ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے ٹھیک اِسی موقع کا انتخاب کیا۔ اُن کی اِس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ معبود وہی ہو سکتا ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہو۔ انسان اپنے آپ کو اُسی کے حوالے کر سکتا ہے۔ جو خود فراخیِ افلاک میں خوار و زبوں ہیں، وہ کسی کو کیا دیں گے اور کوئی اپنے آپ کو اُن کے حوالے کیوں کرے گا؟ اِس لیے توحید پر ایمان کے ساتھ یہ اعلان بھی ضروری ہے کہ بندۂ مومن ہر شرک سے بری ہے اور وہ کبھی مشرکین میں سے نہیں ہو سکتا۔

۱۰۴؎ یعنی اُس اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو جسے تم بھی مانتے ہو کہ زمین و آسمان کا خالق ہے۔ یہ اُنھوں نے اِس لیے فرمایا کہ اُن کی قوم خدا کی منکر نہ تھی، بلکہ اُس دور کی تمام دوسری قوموں کی طرح اُس کے شریک ٹھیراتی تھی۔

تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ
بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ
وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾

کیے ہوئے ہے[107]۔ پھر کیا تم دھیان نہیں کرتے؟ اور میں اُن چیزوں سے کیسے ڈروں جنھیں تم شریک ٹھیراتے ہو، جبکہ تمھارا حال یہ ہے کہ تم اِس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اُن چیزوں کو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے جن کے حق میں اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے[108]؟ سو (بتاؤ کہ) ہم دونوں فریقوں میں سے کون امن واطمینان کا زیادہ مستحق ہے، اگر تم جانتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ امن واطمینان تو اُنھی کے لیے ہے جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم[109] سے آلودہ نہیں کیا اور وہی راستہ پانے والے ہیں۔ ۸۰-۸۲

جملے کا آخری حصہ بتا رہا ہے کہ یہ تمام واقعہ نبوت کے بعد کا ہے۔

۱۰۵؎ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ دلیل کا جواب دلیل سے دینے کے بجائے اُن کی قوم نے اپنے اوہام سے اُنھیں ڈرانا شروع کر دیا۔ ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے یہ اُنھی ڈراووں کا جواب ہے۔ یہ ڈراوے کیا ہو سکتے تھے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...شرک کی بنیاد... چونکہ تمام تر خوف اور وہم پرستانہ اندیشوں پر ہوتی ہے، اِس وجہ سے قوم کے لوگوں نے طرح طرح سے اُن کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ معبودوں سے نفرت و بغاوت کا اعلان کرتے ہو تو اُن کی پکڑ میں آ جاؤ گے، اندھے ہو جاؤ گے، اپاہج ہو جاؤ گے، تم پر بجلی گرے گی، بری موت مرو گے۔'' (تدبر قرآن ۳/۹۶)

۱۰۶؎ یہ استثنا تفویض الی اللہ کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں، خدا کے اعتماد پر کہہ رہا ہوں۔ میرا ارادہ چاہے جتنا پاک اور عزم جتنا سچا ہو، اُس کی تکمیل اگر ہو سکتی ہے تو اُسی پروردگار کی توفیق سے ہو سکتی ہے۔ ہر راستے کی اپنی آزمایشیں ہیں اور بندۂ مومن اِن آزمایشوں میں اُس کی مدد اور توفیق کے بغیر کسی طرح پورا نہیں اتر سکتا۔

۱۰۷؎ اِس لیے مجھے یہ اندیشہ بھی نہیں ہے کہ اُس کی لاعلمی میں کوئی مجھے نقصان پہنچا دے گا۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿٨٣﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٨٤﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى

یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیم کو عطا فرمائی کہ اپنی قوم پر قائم کرے[110]۔ ہم جس کو چاہتے ہیں، اُس کے درجے پر درجے بلند کر دیتے ہیں[111]۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار حکیم و علیم ہے[112]۔ (پھر یہی نہیں)، ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب عنایت فرمائے۔ اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے ہدایت بخشی۔ اِس سے پہلے یہی ہدایت ہم نے نوح کو بخشی تھی اور (ابراہیم کے بعد) اُس کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ ہم نیکوکاروں کو اِسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس[113] کو بھی۔ یہ سب نیکوکاروں میں سے تھے۔ اور اسمٰعیل، یسع[114]، یونس اور لوط کو

۱۰۸؎ یعنی خدا کے غضب اور اُس کے قہر سے ڈرنا تو تمھیں چاہیے کہ اُس کی سند کے بغیر اُس کے شریک ٹھیراتے اور اُس پر جھوٹ باندھتے ہو۔

۱۰۹؎ اِس سے مراد وہی شرک ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام کی قوم مبتلا تھی۔

۱۱۰؎ یہ قرآن نے خود واضح کر دیا ہے کہ اوپر نجوم و کواکب اور مہ و آفتاب کے طلوع و غروب کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنا کوئی فکری ارتقا نہیں، بلکہ اُن کے استدلال کا بیان ہے جو اُنھوں نے توحید کی دعوت کے لیے اختیار فرمایا۔ آیت میں 'عَلٰى قَوْمِهٖ' کے الفاظ اِس پر صریح دلیل ہیں۔

۱۱۱؎ اصل میں لفظ 'دَرَجٰتٍ' آیا ہے۔ یہ جمع بھی ہے اور اِس پر تنوین بھی ہے۔ ہم نے ترجمے میں یہ چیزیں ملحوظ رکھی ہیں۔

۱۱۲؎ مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ چاہنا الل ٹپ نہیں ہوتا، بلکہ ہمارے علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ ہم اپنے قرب کے یہ مدارج اُنھی کو عطا فرماتے ہیں جو اِن کے اہل ہوتے ہیں۔

الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٨٧﴾ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ
وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٨٨﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ
الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا

بھی۔ اِن میں سے ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطا فرمائی تھی[115]۔ نیز اُن کے آبا و اجداد، اُن کی اولاد اور اُن کے بھائی بندوں کو بھی ہم نے اپنی ہدایت سے نوازا، اُنھیں برگزیدہ کیا اور (توحید کی اِسی) صراط مستقیم[116] کی طرف اُن کی رہنمائی فرمائی تھی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے۔ اپنے بندوں میں سے وہ جسے چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق) اِس سے سرفراز فرماتا ہے۔ لیکن اگر کہیں یہ لوگ بھی شرک میں مبتلا ہو گئے ہوتے تو اِن کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا[117]۔ یہی لوگ تھے جنھیں ہم نے کتاب اور حکم[118] اور

---

۱۱۳ یہی وہ پیغمبر ہیں جن کا ذکر بائیبل کے مجموعۂ صحائف میں ایلیا کے نام سے ہوا ہے۔

۱۱۴ اِس سے ملتے جلتے نام کے جن دو پیغمبروں کا ذکر بائیبل میں ہوا ہے، اُن میں سے الیشع قرآن کے تلفظ سے قریب تر ہے۔ اِن کا زمانہ ۸۱۳ق م بتایا جاتا ہے۔ دوسرے یسعیاہ ہیں جن کا زمانہ ۶۲۰ق م بتایا گیا ہے۔

۱۱۵ یہ اُسی عمومی فضیلت کا ذکر ہے جو انبیا علیہم السلام کو اُن کے منصب کے لحاظ سے تمام انسانوں پر حاصل ہوتی ہے۔

۱۱۶ یہ لفظ اصل میں نکرہ آیا ہے، لیکن اِس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔

۱۱۷ یعنی اِس مرتبے کے لوگ بھی اگر کہیں شرک میں مبتلا ہو جاتے تو اُن کا انجام یہی ہوتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...مجرد اِس بنیاد پر اُن کی برگزیدگی قائم نہ رہتی کہ یہ نوح یا ابراہیم کی اولاد ہیں۔ یہ تنبیہ اہل عرب کے لیے بھی ہے اور بنی اسرائیل کے لیے بھی کہ توحید سے منحرف ہو کر جو لوگ مجرد اُس نسبت پر برگزیدگی کے خواب دیکھ رہے ہیں جو اُنھیں ابراہیم کی اولاد ہونے کے سبب سے حاصل ہے، وہ نری حماقت میں مبتلا ہیں۔ یہ تو درکنار اگر وہ بھی شرک میں آلودہ ہو جاتے تو خدا کے ہاں اُن کا بھی کوئی وزن باقی نہ رہ جاتا۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۰۲)

۱۱۸ اِس سے مراد وہ اختیار و اقتدار ہے جو اِن بزرگوں کو کسی نہ کسی حیثیت سے حاصل رہا اور جس کی بنا پر یہ موقع

لَّیۡسُوۡا بِهَا بِکٰفِرِیۡنَ ﴿۸۹﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقۡتَدِهۡ قُلۡ لَّآ
اَسۡئَلُکُمۡ عَلَیۡهِ اَجۡرًا اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِکۡرٰی لِلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۹۰﴾

نبوت عطا کی تھی۔ (تمھارے) یہ (مخاطبین) اِس کا انکار کریں گے تو (کچھ پروا نہیں)، ہم نے یہ نعمت کچھ اور لوگوں کے سپرد کر دی ہے جو اِس کے منکر نہیں ہیں[۱۱۹]۔ (علم نبوت کے جن حاملین کا ہم نے ذکر کیا ہے)، وہی تھے جو اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے۔ سو اُنھی کے طریقے کی پیروی کرو۔ (اِن لوگوں سے، البتہ) کہہ دو کہ میں (اپنی) اِس (دعوت) پر تم سے کوئی صلہ نہیں چاہتا (کہ نہیں مانو گے تو میرا کوئی نقصان ہو جائے گا)۔ یہ تو محض ایک یاد دہانی ہے تمام دنیا والوں کے لیے[۱۲۰]۔ ۸۳-۹۰

اِنھیں حاصل ہوا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق تمام معاملات کے فیصلے کتاب الٰہی کے مطابق کریں۔

۱۱۹؎ اصل میں 'وَکَّلۡنَا بِهَا قَوۡمًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'ب' اِس بات کا قرینہ ہے کہ 'وَکَّلۡنَا' کے لفظ میں ذمہ دار بنائے جانے کے ساتھ امین اور ضامن بنائے جانے کا مفہوم بھی شامل ہو گیا ہے۔ 'قَوۡمًا' سے صحابۂ کرام کی وہ جماعت مراد ہے جو یثرب سے آ کر اِس ہدایت سے بہرہ یاب ہوئی اور جس کی نصرت سے ایک ایسی قوم پیدا ہوئی جو پورے عالم کے لیے دعوت توحید کی علم بردار بن گئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اِس ٹکڑے میں صحابہ کی استقامت اور مستقبل میں امت کی کثرت کی پیشین گوئی ہے اور اِس پہلو سے یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عظیم بشارت ہے جو اُس دور میں آپ کو دی گئی، جب آپ مخالفتوں کے طوفان سے گزر رہے تھے۔ الفاظ سے تقدیر الٰہی کا وہ اٹل فیصلہ بھی مترشح ہو رہا ہے جو اِس دعوت کو فتح مند کرنے کے لیے ہو چکا ہے اور یہ اشارہ بھی نکل رہا ہے کہ اللہ نے اپنے جن بندوں کو اِس کے لیے کھڑا کر دیا ہے، اُن کی قلت تعداد پر نہ جاؤ، یہی لوگ اِس دعوت کے علمبردار ہوں گے اور یہی قطرے ایک دن سمندر بنیں گے۔''
>
> (تدبر قرآن ۳/ ۱۰۳)

۱۲۰؎ اصل میں لفظ 'ذِکۡرٰی' استعمال ہوا ہے۔ یہ قرآن کے لیے آیا ہے اور دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...ایک تو اِس حقیقت کی طرف کہ وہ جو کچھ پیش کر رہا ہے، وہ کوئی اوپری اور انوکھی بات نہیں ہے، بلکہ اُنھی حقائق کی یاد دہانی ہے جو انسانی فطرت کے اندر ودیعت ہیں، لیکن لوگوں نے اُن کو اپنی خواہشات و بدعات کے

نیچے دبا دیا ہے۔ دوسرے اِس حقیقت کی طرف کہ یہ اُسی ہدایت الٰہی کی یاددہانی کررہا ہے جس کو نوح، ابراہیم اور تمام انبیا لے کر آئے، لیکن اُن کے ساتھ نسبت کے مدعیوں نے اِس ہدایت الٰہی کی جگہ مختلف ناموں سے مختلف ضلالتیں ایجاد کر لیں اور اُنھی ضلالتوں کو اپنے بزرگوں کا دین سمجھ بیٹھے۔ قرآن اپنی اس تذکیر سے تاریخ کے فراموش کردہ اوراق کو بھی یاد دلا رہا ہے اور فطرت کے فراموش کردہ اسباق کو بھی۔ پس جس کا جی چاہے، اُس سے فائدہ اٹھائے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۰۴)

[باقی]

ساجد حمید

نفلی اعمال میں دوام

عَنْ عَائِشَةَ، رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا، أَنَّهَا قَالَتْ: سُئِلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ أَیُّ الْأَعْمَالِ أَحَبُّ إِلَی اللّٰهِ؟ قَالَ: أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ. وَقَالَ: اکْلَفُوْا مِنَ الْأَعْمَالِ، مَا تُطِیقُوْنَ. (بخاری، رقم ۶۱۰۰)

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سا عمل اللہ کے ہاں سب سے زیادہ پسندیدہ[1] ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ عمل جو دائمی ہو[2]، خواہ وہ تھوڑا ہی ہو۔ پھر آپ نے فرمایا: اعمال میں سے وہ عمل اختیار کرو[3] جس کی تم میں طاقت واستطاعت ہو۔''

ترجمے کے حواشی

۱۔ یہ سوال نفلی اعمال کے بارے میں تھا، جیسا کہ حدیث کے باقی مضمون سے واضح ہے۔ صحابہ میں سے کوئی یہ جاننا چاہتا تھا کہ فرائض کے بعد وہ کون سا عمل ہے جو اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے تاکہ وہ اس عمل کو اپنائے۔

۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ ہمارے نفلی اعمال میں وہ عمل اللہ کو سب سے زیادہ پسندیدہ ہے جو ہم مسلسل کرتے رہے ہوں، اگرچہ وہ قلیل ترین ہی کیوں نہ ہو۔

۳۔ عربی متن میں 'اِکْلَفُوْا' کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی مکلّف کرنے اور پسند کرنے کے آتے ہیں۔ ''لسان العرب'' (۹/۳۰۷) میں ہے: 'وَیُقَالُ: کَلِفْتُ بِهٰذَا الْأَمْرِ أَیْ أُوْلِعْتُ بِهٖ' (اور کہا جاتا ہے: 'کَلِفْتُ بِهٰذَا الْأَمْرِ'

تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ میں نے اس کام کو پسند کیا)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ تم اعمال میں سے جب کوئی چنو تو ایسے عمل کو چنو جو تمھاری ہمت وقوت کے مطابق ہوتا کہ تم اسے مسلسل کر سکو۔ طاقت سے زیادہ کام اپنے ذمے لو گے تو ایک دو دفعہ میں تھک ہار کر بیٹھ جاؤ گے، لیکن اگر تم طاقت وہمت کے مطابق کوئی عمل اختیار کرو گے تو اسے مسلسل کر سکو گے۔

یہ جملہ نفلی کاموں کی طرف اشارہ کرتا ہے، اس لیے کہ فرائض میں سے تو ہمیں چننے کا اختیار نہیں دیا گیا۔ اسی طرح اوپر 'خواہ وہ تھوڑا ہی ہو' کی شرط بھی یہ بتاتی ہے کہ یہ نفلی اعمال سے متعلق ہدایت ہے۔

وسیم اختر مفتی

زبیر بن عوّام رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین
کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(۲)

حضرت زبیر بن عوام کے پڑوس میں ایک انصاری صحابی (حمید) رہتے تھے۔ دونوں کے ایک دوسرے سے متصل کھجوروں کے باغات تھے جنھیں ایک پہاڑی نالہ سیراب کرتا۔ پانی حضرت زبیر کے باغ سے ہوکر انصاری کے نخلستان میں پہنچتا۔ سیدنا زبیر پانی روک کر اپنی زمین سینچ لیتے پھر انصاری کی طرف جانے دیتے۔ ایک بار ان دونوں کا آپس میں جھگڑا ہوا۔ انصاری نے کہا، پانی (بغیر رکاوٹ کے میرے پیڑوں کی طرف) بہنے دو، حضرت زبیر نہ مانے۔ آخر کار دونوں یہ قضیہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ آپ نے حکم فرمایا، زبیر! اپنا باغ سیراب کرلو پھر اپنے پڑوسی کے لیے پانی چھوڑ دو۔ انصاری غضب ناک ہوگیا اور کہا، (یہ فیصلہ) اس لیے کہ یہ آپ کا پھوپھی زاد بھائی ہے؟ غصے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ آپ نے فرمایا، زبیر! کھجوریں سیراب کرلو پھر پانی روکے رکھو حتیٰ کہ یہ پشتوں اور منڈیروں کو بھی تر کر دے۔ تب آپ نے زبیر کو پورا حق دلایا حالانکہ اس سے پہلے آپ نے ایسا مشورہ دیا تھا جس میں زبیر اور انصاری دونوں کے لیے سہولت تھی۔ حضرت زبیر کہتے ہیں، میرا خیال ہے، اسی واقعہ کی بعد قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئیں، ''فلا وربك لا یؤمنون حتی یحکّموك فیما شجر بینھم، ہرگز نہیں! تیرے رب کی قسم! یہ مومن نہ ہوں گے حتیٰ کہ اپنے جھگڑوں میں آپ کو حکم تسلیم نہ کرلیں'' (النساء ۴: ۶۵) (بخاری: ۲۳۵۹، ۲۷۰۸، مسلم: ۶۰۶۵)۔ ایک دوسری روایت کے مطابق یہ واقعہ زبیر اور حاطب بن ابی بلتعہ کے مابین پیش آیا۔ حاطب مہاجر تھے اور غزوۂ بدر میں حصہ لے چکے تھے۔

زبیر بن عوام عہد رسالت میں وحی کی کتابت بھی کرتے تھے۔ انھوں نے آنجناب کا وہ خط تحریر کیا جو آپ نے

بنومعاویہ کو بھیجا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی راہ خدا انفاق کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ایک باراسما رضی اللہ عنہا بنت ابوبکر جوسیدہ عائشہ کی بہن اورزبیر بن عوام کی اہلیہ تھیں،آپ کے پاس آئیں اور کہا،یارسول اللہ! میرا اپنا تو کوئی مال نہیں ،وہی ہے جوزبیر نے دے رکھا ہے۔کیا میں اسے بھی صدقہ کرڈالوں؟ آپ نے فرمایا،دے ڈالو،تم مال دینے میں بخل کروگی تو اللہ کافضل وکرم تم سے روک لیا جائے گا۔(بخاری:۲۵۹۰،مسلم :۲۳۷۵)زبیر بن عوام کی دیانت وامانت مسلم تھی۔حضرت عثمان کے علاوہ مقداد،ابن مسعوداورابن عوف نے بھی انھیں وصی بنایا تاکہ ان کے بعد کے ان کے مال واولاد کی نگہداشت کریں۔

حضرت زبیر بن عوام تھے جنھوں نے اسلام کے لیے سب سے پہلے تلوار سونتی۔ایک بارمکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی افواہ پھیلی تو زبیر ننگی تلوار سوت کر باہر نکل آئے۔جب آپ کو دیکھ لیا تو تلوار میان میں ڈالی۔آپ نے ان کے لیے اورتلوار کے لیے دعافرمائی۔دوسروں کوضرب لگانے والے کوکبھی خودبھی چوٹ کھانا پڑتی ہے۔ان کے جسم پرتلوار سے لگے ہوئے تین گھاؤ تھے۔ان میں سے دو جنگ بدر۳ھ میں اورایک جنگ یرموک ۱۳ھ میں لگا تھا(دوسری روایت میں الٹ ترتیب کے ساتھ ایک گھاؤ جنگ بدر میں اوردو معرکۂ یرموک میں لگنے کا ذکر ہے)۔ان کے چھوٹے بیٹے عروہ کہتے ہیں،میں بچپن میں اپنی انگلیاں مونڈھے کے گھاؤ میں ڈال کرکھیلا کرتا تھا۔(بخاری:۳۹۷۳)زبیر بن عوام کی تلوار پر چاندی جڑی ہوئی تھی۔اس میں ایک دندانہ بھی تھا جو جنگ بدر(یاجنگ خندق)کے دن پڑا تھا۔یہی تلواران کے بیٹے عبداللہ کے پاس آئی اور جب حجاج بن یوسف نے ان کوشہید کیا تو اسی دندانے کی نشانی سے پہچان کران کے بھائی عروہ بن زبیر کو دے دی گئی۔اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے تلوار ان کے حوالہ کرتے ہوئے مشہورعرب شاعرنابغہ ذبیانی کا یہ شعربھی پڑھا

ولا عیب فیھم غیر ان سیوفھم   بھن فلول من قراع الکتائب

ان دلیروں میں کوئی عیب نہیں مگر اتنا ہی کہ لشکروں سے بھڑنے کی وجہ سے ان کی تلواروں میں دندانے پڑے ہیں۔

(بخاری:۳۹۷۳)

عبداللہ بن زبیر نے اپنے والد سے پوچھا،کیابات ہے کہ میں نے آپ کورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس طرح بیان کرتے نہیں سنا جیسے فلاں فلاں صحابی روایت کرتے ہیں؟ حضرت زبیر نے جواب دیا،میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت نہیں چھوڑی(کہ آپ کی باتیں یاد نہ ہوں)لیکن آپ کا یہ ارشاد سن رکھا ہے،جس نے مجھ سے

جھوٹ منسوب کیا وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنا لے۔ (بخاری: ۱۰۸) انس بھی یہی کہتے تھے پھر بھی ان سے بے شمار احادیث مروی ہیں۔

حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبل حرا پر تھے۔ آپ کے ساتھ ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ اور زبیر تھے۔ ایک چٹان ہلی تو آپ نے فرمایا، رک، ساکن ہو جا! تم پر نبی، صدیق اور شہید کے علاوہ کوئی نہیں۔ (مسلم: ۶۱۹۷)

زبیر بن عوام کا رنگ گندمی، جسم میانہ اور ڈاڑھی ہلکی تھی۔ قد بہت لمبا نہ تھا تاہم کہا جاتا ہے، وہ گھوڑے پر سوار ہوتے تو پاؤں زمین پر لگتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمان بن عوف اور زبیر بن عوام کو ریشمی قمیص پہننے کی رخصت عطا کی کیونکہ ان دونوں نے خارش اور جوؤں کی شکایت کی تھی۔ (بخاری: ۲۹۲۰، مسلم: ۵۳۹۶) حضرت زبیر بن عوام اپنے بالوں کو خضاب نہ لگاتے تھے۔

حضرت زبیر کے ۱۱ بیٹے اور ۹ بیٹیاں ہوئیں۔ اسما بنت ابوبکر سے عبداللہ، عروہ، منذر، عاصم، مہاجر، خدیجۂ کبری، ام حسن اور عائشہ کی ولادت ہوئی۔ ام خالد (امہ بنت خالد بن سعید جو حبشہ میں پیدا ہوئی تھیں) سے خالد، عمرو، حبیبہ، سودہ اور ہند نے جنم لیا۔ رباب بنت انیف کلبیہ سے مصعب، حمزہ اور رملہ ہوئے۔ زینب بنت مرثد نے عبیدہ اور جعفر کو جنم دیا۔ ام کلثوم بنت عقبہ سے زینب کی پیدائش ہوئی۔ حلال بنت قیس سے خدیجۂ صغری پیدا ہوئیں۔ حضرت عمر کی بیوہ عاتکہ بنت زید سے بھی حضرت زبیر کی شادی ہوئی جن سے ان کا بیٹا عیاض پیدا ہوا۔ حضرت زبیر فرماتے ہیں، طلحہ بن عبیداللہ اپنے بچوں کے نام انبیا علیہم السلام کے ناموں پر رکھتے ہیں۔ میں نے اپنی اولاد کو شہدا (عبداللہ بن جحش، منذر بن عمرو، عروہ بن مسعود، حمزہ بن عبدالمطلب، جعفر بن ابوطالب، مصعب بن عمیر، عبیدہ بن حارث، خالد بن سعید اور عمرو بن سعید) کے ناموں سے موسوم کیا ہے، امید ہے، ان کی طرح یہ بھی شہادت سے سرفراز ہو جائیں۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویہ (ابن ہشام)، الطبقات الکبری (ابن سعد)، الجامع المسند الصحیح (بخاری)، صحیح مسلم، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، البدایہ و النہایہ (ابن کثیر)، فتح الباری (ابن حجر)، الاصابہ فی تمییز الصحابہ (ابن حجر)

محمد عمار خان ناصر

غلبہ دین بطور دلیل نبوت

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(۵)

(گذشتہ سے پیوستہ)

سابقہ صفحات میں ہم قرآن وحدیث اور سیرت میں موضوع سے متعلق سارے مواد کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان مآخذ میں جہاد وقتال کی دو الگ الگ صورتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک صورت کا تعلق عمومی انسانی اخلاقیات سے ہے جبکہ دوسری میں اللہ تعالیٰ کے ایک مخصوص قانون یعنی کسی قوم پر اتمام حجت کے بعد اس پر سزا کے نفاذ کو روبعمل لانے کے لیے تلوار اٹھائی جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخالفین کے معاملے میں قتال کی یہ دونوں صورتیں رونما ہوئیں۔ آپ کے مخالفین نے آپ اور آپ کے پیروکاروں کے خلاف ظلم وتشدد کا رویہ اختیار کیا اور طاقت وقوت کے زور پر انھیں ان کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان کے ظلم وعدوان اور فتنہ وفساد کو رفع کرنے کے لیے مسلمہ اور ابدی اخلاقیات کی رو سے مسلمانوں کو ان کے خلاف جہاد کرنے کی نہ صرف اجازت دی گئی بلکہ اسے ان پر فرض قرار دے دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ایک رسول تھے اور آپ کی بعثت، قانون رسالت کے مطابق، اس مشن کے تحت اور اس کی تکمیل کے پیشگی وعدے کے ساتھ ہوئی تھی کہ آپ کو ہر حال میں اپنے مخالفوں اور منکروں پر غلبہ حاصل ہوگا، اس لیے یہ بات روز اول سے واضح کر دی گئی تھی کہ آپ پر ایمان لانے والوں کے لیے غلبہ اور سرفرازی، جبکہ مخالفین اور منکروں کے لیے مغلوبیت، رسوائی اور

محکومی مقدر کر دی گئی ہے۔ چنانچہ آپ کے جہاد کا یہ ہدف شروع ہی سے واضح کر دیا گیا کہ یہ عام انسانی اخلاقیات کے دائرے میں فتنہ وفساد کے ازالے تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اس سے بڑھ کر خدا کے قانون جزا وسزا کو سر زمین عرب پر روبہ عمل کرنے کا ذریعہ بنے گا۔

اس ضمن میں متعلقہ نصوص اور اقدامات کے اصل پس منظر اور ان میں موجود داخلی شواہد کو نظر انداز کرتے ہوئے اس پورے عمل کی توجیہ دفاع اور تحفظ کے اصول پر کرنے کا جو رجحان دور جدید میں پیدا ہوا ہے، اس کا محرک، جو فی نفسہ مخلصانہ اور قابل احترام ہے، بظاہر یہ دکھائی دیتا ہے کہ غیر مسلم دنیا کے سامنے اسلام اور پیغمبر اسلام کا مثبت تعارف پیش کیا جائے۔ معاصر ذہنی فضا میں 'مثبت تعارف' کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام کو امن وسلامتی کا مذہب اور پیغمبر اسلام کو صلح وآشتی کا پیغامبر ثابت کیا جائے۔ ہماری رائے میں اسلام کے تعارف کا یہ پہلو اپنی جگہ بالکل درست ہے، لیکن اس معاملے کا ایک دوسرا اور اس سے زیادہ اہم پہلو بھی ہے جسے اگر پورے توازن کے ساتھ ملحوظ نہ رکھا جائے تو خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کی تفہیم کا معاملہ خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

ہم نے قرآن مجید اور صحف سماوی کی روشنی میں قوموں کی جزا وسزا کے اس قانون کا یہ پہلو واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مختلف زمانوں میں کفر وشرک اور بدکاری میں مبتلا قوموں کے محاسبہ اور مواخذہ کا اختیار خود انسانوں میں سے بعض منتخب گروہوں کو دیتے رہے ہیں جو خدا کے اذن کے تحت اپنے دائرۂ اختیار میں آنے والی بدکار قوموں کے خلاف جنگ کرتے اور قتل، اسارت اور محکومی کی صورت میں انھیں ان کی بداعمالیوں کی سزا دیتے ہیں۔ اقوام عالم کے سامنے اس منتخب گروہ کی اس خصوصی حیثیت کو علیٰ رؤوس الاشہاد مبرہن کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے خصوصی تائید اور نصرت حاصل ہوتی ہے اور خدا ان کے دشمنوں کو ان کے مقابلے میں ذلیل ورسوا کر کے دنیا کی قوموں پر یہ واضح کر دیتا ہے کہ وہ دنیا میں خدا کے نمائندے ہیں اور ان کا دین ہی خدا کا پسندیدہ دین ہے۔ تاریخ میں اللہ کے اس قانون کی تفصیلات بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل، دونوں کے حوالے سے محفوظ ہیں۔ یہاں اس کی بعض تفصیلات کا مطالعہ دلچسپی کا موجب ہوگا۔

بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے یہ میثاق لیا تھا کہ وہ اللہ کے دیے ہوئے دین وشریعت پر خود قائم رہتے ہوئے دنیا کی اقوام کے سامنے شہادت حق کا فریضہ انجام دیتے رہیں گے۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ

کا ان سے وعدہ ہے کہ وہ دنیا میں سربلند و سرفراز اور اپنے دشمنوں پر غالب رہیں گے، لیکن اس سے انحراف کی صورت میں خدا کی طرف سے ذلت و رسوائی اور مغلوبیت و محکومی کا عذاب ان پر مسلط کر دیا جائے گا۔ ارشاد ہوا ہے:

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنجَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُم سُوءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَاءكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءكُمْ وَفِي ذَلِكُم بَلاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ۔ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ۔ (ابراہیم ۱۴: ۶-۷)

''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو جب اس نے تمھیں آل فرعون سے نجات دلائی جو تمھیں بدترین عذاب چکھاتے تھے اور تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑی آزمایش تھی۔ اور جب تمہارے رب نے یہ اعلان کیا کہ (اے بنی اسرائیل) اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو گے تو میں تم پر مزید احسانات کروں گا اور اگر ناشکری کا رویہ اختیار کرو گے تو بے شک میرا عذاب بڑا دردناک ہے۔''

بنی اسرائیل کے ساتھ اس معاملہ الٰہی کا آغاز ان کے خروج مصر سے ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دعوت توحید کے بعد جب فرعون اور اس کی قوم نے ان کی تکذیب کا رویہ اختیار کیا تو ایک خاص عرصے تک انھیں مختلف نشانیاں دکھا کر اور متنوع آزمایشوں میں مبتلا کر کے انھیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی گئی:

وَمَا نُرِيهِم مِّنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا وَأَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۔ (الزخرف ۴۳: ۴۸)

''اور ہم ان کو جو بھی نشانی دکھاتے تھے، وہ اپنے سے پہلی نشانی سے بڑی ہوتی تھی۔ اور ہم نے ان کو عذاب میں گرفتار کیا تا کہ وہ پلٹ آئیں۔''

امتحان و ابتلا کی مہلت ختم ہونے کے باوجود جب اہل مصر ایمان نہ لائے تو فرعون کو اس کے پورے لشکر سمیت دریاے نیل میں غرق کر دیا گیا۔ وقت کی ایک عظیم سلطنت کی تباہی و بربادی کا یہ عبرت ناک واقعہ اس وقت مصر کے اردگرد بسنے والی قوموں کے لیے خداے واحد کی قدرت و حقانیت اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ منصب فضیلت کی ایک بین دلیل بن گیا:

فَلَمَّا آسَفُونَا انتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ۔ فَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفاً وَمَثَلاً

''پس جب انھوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا۔ پھر ہم نے ان

لِلْاٰخِرِيْنَ۔ (الزخرف ۴۳: ۵۵، ۵۶)

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَى عَلَى بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (الاعراف ۷: ۱۳۷)

کو بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت کا ایک نمونہ بنا دیا۔‘‘

’’اور بنی اسرائیل کی ثابت قدمی کی بدولت تیرے رب کا مبارک وعدہ ان کے حق میں پورا ہو گیا۔ اور فرعون اور اس کی قوم جو کچھ بناتے اور جو کچھ چھتریوں پر چڑھاتے تھے، ہم نے اس سب کو برباد کر کے رکھ دیا۔‘‘

تورات میں ہے:

’’اور خداوند نے موسیٰ سے فرمایا کہ بنی اسرائیل کو حکم دے کہ وہ لوٹ کر مجدال اور سمندر کے بیچ فی ہخیر وت کے مقابل بعل صفوان کے آگے ڈیرے لگائیں۔ اسی کے آگے سمندر کے کنارے کنارے ڈیرے لگانا۔ فرعون بنی اسرائیل کے حق میں کہے گا کہ وہ زمین کی الجھنوں میں آ کر بیابان میں گھر گئے ہیں اور میں فرعون کے دل کو سخت کروں گا اور وہ ان کا پیچھا کرے گا اور میں فرعون اور اس کے سارے لشکر پر ممتاز ہوں گے اور مصری جان لیں گے کہ خداوند میں ہوں اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔‘‘ (خروج ۱۴: ۱۔۴)

اردگرد کی اقوام پر اس واقعے سے ہیبت، رعب اور دبدبہ کی جو کیفیت طاری ہوئی، اس کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے:

’’قومیں سن کر تھرا گئی ہیں

اور فلستین کے باشندوں کی جان پر آ بنی ہے۔

ادون کے رئیس حیران ہیں۔

موآب کے پہلوانوں کو کپکپی لگ گئی ہے۔

کنعان کے سب باشندوں کے دل پگھلے جاتے ہیں۔

خوف و ہراس ان پر طاری ہے۔

تیرے بازو کی عظمت کے سبب سے وہ پتھر کی طرح بے حس و حرکت ہیں۔

جب تک اے خداوند تیرے لوگ نکل نہ جائیں۔

جب تک تیرے لوگ جن کو تو نے خریدا ہے پار نہ ہو جائیں۔

تو ان کو وہاں لے جا کر اپنی میراث کے پہاڑ پر درخت کی طرح لگائے گا۔

تو ان کو اسی جگہ لے جائے گا جسے تو نے اپنی سکونت کے لیے بنایا ہے۔'' (خروج ۱۵: ۱۴۔۱۷)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کو عطا کی جانے والی اس نصرت اور غلبے کو ان کی پوری تاریخ میں ایک بنیادی حوالے کی حیثیت حاصل رہی۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی سرکشی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر ہلاکت مسلط کی گئی تو موسیٰ علیہ السلام نے اسی چیز کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ سے عفو و درگزر کی درخواست کی:

''پس اگر تو اس قوم کو ایک اکیلے آدمی کی طرح جان سے مار ڈالے تو وہ قومیں جنھوں نے تیری شہرت سنی ہے کہیں گی کہ چونکہ خداوند اس قوم کو اس ملک میں جسے اس نے ان کو دینے کی قسم کھائی تھی، پہنچا نہ سکا اس لیے اس نے ان کو بیابان میں ہلاک کر دیا۔'' (گنتی ۱۴: ۱۶)

موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر جب ارض مقدس کی طرف روانہ ہوئے اور راستے میں بعض حکمرانوں نے رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو انھوں نے اسی بات کا حوالہ دیا:

''اور موسیٰ نے قادس سے ادوم کے بادشاہ کے پاس ایلچی روانہ کیے اور کہلا بھیجا کہ تیرا بھائی اسرائیل یہ عرض کرتا ہے کہ تو ہماری سب مصیبتوں سے جو ہم پر آئیں واقف ہے کہ ہمارے باپ دادا مصر میں گئے اور ہم بہت مدت تک مصر میں رہے اور مصریوں نے ہم سے اور ہمارے باپ دادا سے برا برتاؤ کیا اور جب ہم نے خداوند سے فریاد کی تو اس نے ہماری سنی اور ایک فرشتہ کو بھیج کر ہم کو مصر سے نکال لے آیا ہے اور اب ہم قادس شہر میں ہیں جو تیری سرحد کے آخر میں واقع ہے سو ہم کو اپنے ملک میں سے ہو کر جانے کی اجازت دے۔'' (گنتی ۲۰: ۱۴۔۱۷)

موآبیوں کے بادشاہ بلق بن صفور نے بنی اسرائیل کے بڑھتے ہوئے لشکر سے خوف زدہ ہو کر بلعام بن بعور نامی بزرگ ہستی سے یہ درخواست کی کہ وہ موآب کے حق میں کامیابی کی دعا اور بنی اسرائیل کے خلاف بددعا کرے۔ بلعام نے ان کو جواب دیا:

''اٹھ اے بلق اور سن۔

اے صفور کے بیٹے! میری باتوں پر کان لگا۔

خدا انسان نہیں کہ جھوٹ بولے

اور نہ وہ آدم زاد ہے کہ اپنا ارادہ بدلے۔

کیا جو کچھ اس نے کہا اسے نہ کرے؟

یا جو فرمایا ہے اسے پورا نہ کرے؟
دیکھ! مجھے تو برکت دینے کا حکم ملا ہے۔
اس نے برکت دی ہے اور میں اسے پلٹ نہیں سکتا۔
وہ یعقوب میں بدی نہیں پاتا
اور نہ اسرائیل میں کوئی خرابی دیکھتا ہے۔
خداوند اس کا خدا اس کے ساتھ ہے
اور بادشاہ کی سی للکار ان کے لوگوں کے بیچ میں ہے۔
خدا ان کو مصر سے نکال کر لیے آ رہا ہے۔
ان میں جنگلی سانڈ کی سی طاقت ہے۔
یعقوب پر کوئی افسون نہیں چلتا
اور نہ اسرائیل کے خلاف فال کوئی چیز ہے۔
بلکہ یعقوب اور اسرائیل کے حق میں اب یہ کہا جائے گا
کہ خدا نے کیسے کیسے کام کیے۔'' (گنتی ۲۳: ۱۸۔۲۳)

شام اور عراق کی جس سرزمین کو بنی اسرائیل کی میراث قرار دیا گیا تھا، اسے فتح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت کے اسی قانون کا حوالہ دیا گیا:

قَالَ رَجُلاَنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُونَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُواْ عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُواْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِيْنَ (مائدہ ۵: ۲۳)

''دو آدمیوں نے، جو اللہ سے ڈرنے والوں میں سے تھے اور اللہ نے ان پر انعام کیا تھا، کہا کہ (اے بنی اسرائیل) شہر کے دروازے میں داخل ہو جاؤ۔ پس جب تم داخل ہو جاؤ گے تو تمھی غالب رہو گے۔ اور اگر تم سچ مچ ایمان رکھتے ہو تو اللہ ہی پر بھروسہ رکھو۔''

تورات میں ہے:

''اگر تم ان سب حکموں کو جو میں تم کو دیتا ہوں جانفشانی سے مانو اور ان پر عمل کرو اور خداوند اپنے خدا سے محبت رکھو اور اس کی سب راہوں پر چلو اور اس سے لپٹے رہو تو خداوند ان سب قوموں کو تمہارے آگے سے نکال ڈالے گا اور تم ان قوموں پر جو تم سے بڑی اور زور آور ہیں، قابض ہو گے۔ جہاں جہاں تمہارے پاؤں کا تلوا ٹکے، وہ جگہ

تمھاری ہو جائے گی، یعنی بیابان اور لبنان سے اور دریاے فرات سے مغرب کے سمندر تک تمھاری سرحد ہوگی اور کوئی شخص وہاں تمھارا مقابلہ نہ کر سکے گا کیونکہ خداوند تمھارا خدا تمھارا رعب اور خوف اس تمام ملک میں جہاں کہیں تمھارے قدم پڑیں، پیدا کر دے گا جیسا اس نے تم سے کہا ہے۔'' (استثنا ۱۱: ۲۲-۲۵)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں جب بنی اسرائیل کی حکومت واقتدار اپنے عروج کو پہنچے اور انھوں نے اللہ کی یاد کے لیے ایک عظیم الشان عبادت گاہ تعمیر کی تو اسی اصول کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے یہ دعا کی:

''اب رہا وہ پردیسی جو تیری قوم اسرائیل میں سے نہیں ہ، وہ جب دور ملک سے تیرے نام کی خاطر آئے (کیونکہ وہ تیرے بزرگ نام اور قوی ہاتھ اور بلند بازو کا حال سنیں گے) سو جب وہ آئے اور اس گھر کی طرف رخ کر کے دعا کرے تو تو آسمان پر سے جو تیری سکونت گاہ ہے، سن لینا اور جس جس بات کے لیے وہ پردیسی تجھ سے فریاد کرے تو اس کے مطابق کرنا تاکہ زمین کی سب قومیں تیرے نام کو پہچانیں اور تیری قوم اسرائیل کی طرح تیرا خوف مانیں اور جان لیں کہ یہ گھر جسے میں نے بنایا ہے، تیرے نام کا کہلاتا ہے۔'' (ا۔سلاطین ۸: ۴۱-۴۳)

''اور یہ میری باتیں جن کو میں نے خداوند کے حضور مناجات میں پیش کیا ہے، دن اور رات خداوند ہمارے خدا کے نزدیک رہیں تاکہ وہ اپنے بندہ کی داد اور اپنی قوم اسرائیل کی داد ہر روز کی ضرورت کے مطابق دے جس سے زمین کی سب قومیں جان لیں کہ خداوند ہی خدا ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں۔'' (ا۔سلاطین ۸: ۵۹، ۶۰)

بنی اسرائیل کو عطا کی جانے والی اسی فضیلت کے اعتراف میں اردگرد کی سب قومیں ان کی مطیع اور باج گزار ہو گئیں اور ان کو حاصل ہونے والا یہ شرف اللہ کے دین کی دعوت کے پھیلنے کا ذریعہ بن گیا:

''اور سلیمان دریاے فرات سے فلستیوں کے ملک تک اور مصر کی سرحد تک سب مملکتوں پر حکمران تھا۔ وہ اس کے لیے ہدیے لاتی تھیں اور سلیمان کی عمر بھر اس کی مطیع رہیں۔'' (ا۔سلاطین ۴: ۲۱)

''اور خدا نے سلیمان کو حکمت اور سمجھ بہت ہی زیادہ اور دل کی وسعت بھی عنایت کی جیسی سمندر کے کنارے کی ریت ہوتی ہے۔ اور سلیمان کی حکمت سب اہل مشرق کی حکمت اور مصر کی ساری حکمت پر فوقیت رکھتی تھی۔'' (ا۔سلاطین ۴: ۲۹، ۳۰)

''اور سب قوموں میں سے زمین کے سب بادشاہوں کی طرف سے جنھوں نے اس کی حکمت کی شہرت سنی تھی،

لوگ سلیمان کی حکمت کو سننے آتے تھے۔''(۱۔سلاطین۴: ۳۴)

''اور جب سبا کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سنی تو وہ آئی تا کہ مشکل سوالوں سے اسے آزمائے۔.... اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ سچی خبر تھی جو میں نے تیرے کاموں اور تیری حکمت کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی۔تو بھی میں نے وہ باتیں باور نہ کیں جب تک خود آ کر اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ نہ لیا اور مجھے تو آدھا بھی نہیں بتایا گیا تھا کیونکہ تیری حکمت اور اقبال مندی اس شہرت سے جو میں نے سنی بہت زیادہ ہے۔خوش نصیب ہیں تیرے لوگ اور خوش نصیب ہیں تیرے یہ ملازم جو برابر تیرے حضور کھڑے رہتے اور تیری حکمت سنتے ہیں۔ خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے ایسا خوشنود ہوا کہ تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا ہے۔چونکہ خداوند نے اسرائیل سے سدا محبت رکھی ہے اس لیے اس نے تجھے عدل اور انصاف کرنے کو بادشاہ بنایا۔''(۱۔سلاطین۱۰:۱۔۹)

شاہ ارام کے لشکر کے سردار نعمان نے، جو کوڑھی تھا، الیشع کے کہنے پر یردن میں سات غوطے مارے اور اس کا مرض دور ہو گیا۔

''پھر وہ اپنی جلو کے سب لوگوں سمیت مرد خدا کے پاس لوٹا اور اس کے سامنے کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ دیکھ اب میں نے جان لیا کہ اسرائیل کو چھوڑ اور کہیں روئے زمین پر کوئی خدا نہیں۔اس لیے اب کرم فرما کر اپنے خادم کا ہدیہ قبول کر۔''(۲۔سلاطین۵:۱۵)

بنی اسرائیل کے انبیا، بادشاہ اور اکابر بالعموم اسی بات کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ سے فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے تھے:

''سو اب اے خداوند ہمارے خدا میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو ہم کو اس کے ہاتھ سے بچا لے تا کہ زمین کی سب سلطنتیں جان لیں کہ تو ہی اکیلا خداوند خدا ہے۔''(۲۔سلاطین۱۹:۱۹)

زبور میں ہے:

''اے خداوند! اے ہماری سپر!

اپنی قدرت سے ان کو پراگندہ کر کے پست کر دے۔

وہ اپنے منہ کے گناہ اور اپنے ہونٹوں کی باتوں

اور اپنی لعن طعن اور جھوٹ بولنے کے باعث

اپنے غرور میں پکڑے جائیں۔

قہر میں ان کو فنا کر دے۔فنا کر دے تا کہ وہ نابود ہو جائیں۔

اور وہ زمین کی انتہا تک جان لیں

کہ خدا یعقوب پر حکمران ہے۔(سلاہ)'' (زبور۵۹:۱۱۔۱۳)

بابل کی اسیری سے خلاصی بھی بنی اسرائیل کو اسی نصرت الٰہی کے نتیجے میں حاصل ہوئی اور ایک مرتبہ پھر اللہ تعالیٰ کا قانون دینونت دنیا کی قوموں کے سامنے آشکارا ہو گیا:

''غرض باون دن میں الول مہینے کی پچیسویں تاریخ کو شہر پناہ بن چکی۔ جب ہمارے سب دشمنوں نے یہ سنا تو ہمارے آس پاس کی سب قومیں ڈرنے لگیں اور اپنی ہی نظر میں خود ذلیل ہو گئیں کیونکہ انھوں نے جان لیا کہ یہ کام ہمارے خدا کی طرف سے ہوا۔''(نحمیاہ۶:۱۵،۱۶)

زبور میں ہے:

''جب خداوند صیون کے اسیروں کو واپس لایا

تو ہم خواب دیکھنے والوں کی مانند تھے۔

اس وقت ہمارے منہ میں ہنسی

اور ہماری زبان پر راگنی تھی۔

تب قوموں میں یہ چرچا ہونے لگا

کہ خداوند نے ان کے لیے بڑے بڑے کام کیے ہیں۔

خداوند نے ہمارے لیے بڑے بڑے کام کیے ہیں

اور ہم شادمان ہیں۔'' (زبور۱۲۶:۱۔۳)

تاہم، جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کیا ہے، یہ قانون یک طرفہ نہیں تھا، بلکہ خود بنی اسرائیل بھی پوری طرح اس کے اطلاق کی زد میں تھے۔قرآن مجید نے 'لئن کفرتم ان عذابی لشدید' کے الفاظ میں اسی پہلو کو بیان کیا ہے۔

بائبل میں ہے:

''اگر تم میری پیروی سے برگشتہ ہو جاؤ اور میرے احکام اور آئین کو جو میں نے تمھارے آگے رکھے ہیں، نہ مانو، بلکہ جا کر اور معبودوں کی عبادت کرنے اور ان کو سجدہ کرنے لگو تو میں اسرائیل کو اس ملک سے جو میں نے ان کو دیا ہے، کاٹ ڈالوں گا اور اس گھر کو جسے میں نے اپنے نام کے لیے مقدس کیا ہے، اپنی نظر سے دور کر دوں گا اور اسرائیل سب قوموں میں ضرب المثل اور انگشت نما ہوگا اور اگرچہ یہ گھر ایسا ممتاز ہے تو بھی ہر ایک جو اس کے پاس سے گزرے گا، حیران ہوگا اور سسکارے گا اور وہ کہیں گے کہ خداوند نے اس ملک اور اس گھر سے ایسا کیوں کیا؟'' (سلاطین ا۹:۱۔۹)

حزقی ایل نبی کی معرفت ارشاد ہوا:

''اور جب میں ان کو اقوام میں پراگندہ اور ممالک میں تتر بتر کروں گا تب وہ جانیں گے کہ میں خداوند ہوں لیکن ان میں سے بعض کو تلوار اور کال سے اور وبا سے بچا رکھوں گا تاکہ وہ قوموں کے درمیان جہاں کہیں ہوں، اپنے تمام نفرتی کاموں کو بیان کریں اور وہ معلوم کریں گے کہ میں خداوند ہوں۔'' (حزقی ایل۱۲: ۱۵، ۱۶)

بابل کے بادشاہ نبوکدنضر نے بنی اسرائیل کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا تو بنی عمون کے سردار احیور نے اس کے سامنے بنی اسرائیل کی پوری سابقہ تاریخ بیان کی اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس خاص معاملے کو واضح کرتے ہوئے کہا:

''اور جہاں کہیں وہ گئے، بغیر تیر کمان کے اور بغیر ڈھال تلوار کے ان کا خدا ان کے لیے لڑا اور غالب ہوا۔ اور کسی نے ان لوگوں کو مغلوب نہ کیا سوائے اس وقت کے جب کہ انھوں نے خداوند اپنے خدا کی عبادت کو ترک کیا۔ تو جتنی دفعہ انھوں نے اپنے خدا کی بجائے اوروں کی پرستش کی، وہ لوٹ اور تلوار اور ننگ کے حوالے کیے گئے۔ اور جتنی دفعہ انھوں نے اپنے خدا کی عبادت ترک کرنے سے توبہ کی، آسمان کے خدا نے ان کو مقابلہ کرنے کی طاقت دی۔ سو انھوں نے اپنے سامنے کنعانیوں اور یبوسیوں اور فرزیوں اور حتیوں اور حویوں اور اموریوں کے بادشاہوں کو اور تمام جباروں کو جو حشبون میں تھے، مغلوب کیا اور ان کی زمینوں اور ان کے شہروں پر قابض ہوئے۔ اور جب تک وہ اپنے خدا کے سامنے خطا نہیں کرتے تھے وہ اچھی حالت میں رہتے تھے کیونکہ ان کا خدا بدی سے نفرت کرتا

ہے۔ اور چند برس ہوئے کہ انھوں نے اس راہ کی مخالفت کی جس میں چلنے کے لیے ان کے خدا نے ان کو حکم دیا تھا تو وہ لڑائیوں میں بہت قوموں کے سامنے مغلوب ہوئے اور ان میں سے بہت اپنے ملک سے دوسرے ملک میں جلا وطن کیے گئے۔ مگر تھوڑے عرصہ سے وہ خداوند اپنے خدا کی طرف پھرے ہیں اور اپنی پراگندگی سے جہاں کہیں الگ الگ ہو گئے تھے، اکٹھے ہو گئے ہیں اور ان تمام پہاڑوں پر چڑھے ہیں اور پھر یروشلم پر قبضہ کر لیا ہے جہاں ان کا مقدس ہے۔ اب اے میرے آقا، دیکھ کہ اگر ان لوگوں نے اپنے خدا کے حضور بدی کی ہے تو ہم ان پر چڑھ جائیں گے کیونکہ ان کا خدا ان کو تیرے حوالے کر دے گا اور وہ تیری طاقت کے جوئے کے نیچے خدمت کریں گے۔ اور اگر ان لوگوں نے اپنے خدا کے حضور بدی نہیں کی تو ان کے خلاف ہماری کچھ طاقت نہیں ہوگی کیونکہ ان کا خدا ان کے لیے لڑے گا اور ہم تمام روئے زمین پر شرم زدہ ہوں گے۔'' (یہودیت ۵: ۱-۲۵)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے آخری پیغمبر کی حیثیت سے بنی اسماعیل میں مبعوث کیا گیا تو آپ اور آپ پر ایمان لانے والے صحابہ کو بھی اللہ کی طرف سے نصرت اور کامیابی کی بشارت دی گئی۔ قرآن میں اہل ایمان کے لیے کامیابی وسرفرازی کے وعدے آپ کے تیئیس سالہ دور نبوت کے ہر ہر مرحلے میں نہایت وضاحت اور تکرار کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

مکی سورتوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون بیان کیا گیا کہ اللہ کے رسولوں کے لیے ناکامی یا شکست کا کوئی سوال نہیں اور وہ ہر حال میں مخالفین پر غالب آ کر رہتے ہیں:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ. إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ. وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ. (الصافات ۳۷: ۱۷۱-۱۷۳)

''اور ہم اپنے جن بندوں کو رسول بنا کر بھیجتے ہیں، ان کے بارے میں ہمارا یہ فیصلہ پہلے سے طے ہو چکا ہے کہ (دشمنوں کے مقابلے میں) انھی کی مدد کی جائے گی اور بے شک ہمارا لشکر ہی غالب آ کر رہے گا۔''

إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ. (غافر ۴۰: ۵۱)

''یقینی بات ہے کہ ہم اپنے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی دنیا میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس دن بھی کریں گے جب (خدا کی عدالت میں) گواہ کھڑے ہوں گے۔''

گزشتہ اقوام پر عذاب الٰہی نازل ہونے کے واقعات بیان کر کے فرمایا:

أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُوْلَئِكُمْ أَمْ لَكُم بَرَاءةٌ فِي الزُّبُرِ ۔ أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرٌ ۔ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ (القمر ۵۴: ۴۳-۴۵)

کیا تمھاری قوم کے کفاران قوموں سے کچھ بہتر ہیں۔تمھارے لیے آسمانی صحیفوں میں برآءت نامہ لکھا ہوا ہے۔کیا ان کا زعم ہے کہ ہم مقابلہ کی قوت رکھنے والی جمعیت ہیں۔(یاد رکھیں کہ) ان کی یہ جمعیت عنقریب شکست کھائے گی اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

یہ اعلان کیا گیا کہ اللہ کے اس قانون کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی اہل ایمان کی کامیابی بھی یقینی ہے:

فَهَلْ يَنتَظِرُونَ إِلاَّ مِثْلَ أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْاْ مِن قَبْلِهِمْ قُلْ فَانتَظِرُواْ إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ۔ ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُواْ كَذَلِكَ حَقّاً عَلَيْنَا نُنجِ الْمُؤْمِنِينَ (یونس ۱۰: ۱۰۲، ۱۰۳)

”پھر کیا یہ بھی (خدا کے عذاب کے) انھی دنوں کا انتظار کر رہے ہیں جو ان سے پہلے گزر جانے والوں پر آئے؟ کہہ دو کہ پس تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ پھر (جب عذاب آئے گا تو) ہم اپنے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کو بچا لیتے ہیں۔اسی طرح ہو گا۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم ایمان لانے والوں کو بچا لیں۔“

مکہ مکرمہ ہی میں آپ کو 'الکوثر' یعنی بیت اللہ کی تولیت حاصل ہونے کی بشارت دے دی گئی اور کہا گیا کہ آپ کے دشمنوں کا نام ونشان تک مٹ جائے گا:

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۔ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۔(الکوثر ۱۰۸: ۱-۳)

”ہم نے تجھے خیر کثیر عطا کر دی۔سو تم اپنے رب کے لیے نماز بھی پڑھو اور قربانی بھی کرو۔ بے شک تمھارے دشمن ہی کا نام ونشان مٹ کر رہے گا۔“

خباب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے مکی عہد میں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مصائب وتکالیف کا شکوہ کیا تو آپ نے فرمایا:

والله ليتمن هذا الامر حتى يسير الراكب من صنعاء الى حضر موت لا يخاف الا الله او الذئب على غنمه ولكنكم تستعجلون۔ (بخاری، رقم ۳۳۴۳)

''بخدا اس دین کا غلبہ اس طرح اپنے درجۂ کمال کو پہنچے گا کہ ایک سوار صنعا سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اسے یا خدا کا خوف ہوگا یا اس بات کا کہ بھیڑیا اس کی بکریوں کو نہ کھا جائے، لیکن بات یہ ہے کہ تم لوگ عجلت کا مظاہرہ کر رہے ہو۔''

مکی دور میں ہی ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے مکہ میں آ کر اسلام قبول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ہدایت کی کہ:

يا ابا ذر اكتم هذا الامر وارجع الى بلدك فاذا بلغك ظهورنا فاقبل۔ (بخاری، رقم ۳۵۲۲)

''ابوذر، اس معاملے کو چھپائے رکھو اور اپنے علاقے میں واپس چلے جاؤ۔ پھر جب تمھیں ہمارے غالب آ جانے کی خبر پہنچے تو آ جانا۔''

بیعت عقبہ کے موقع پر انصار نے اسی یقین کے پیش نظر کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہر حال غلبہ حاصل ہو کر رہے گا، آپ سے یہ یقین دہانی حاصل کی کہ اس کے بعد آپ انھیں چھوڑ کر واپس اپنی قوم کے پاس واپس نہیں چلے جائیں گے:

يا رسول الله ان بيننا وبين الرجال حبالا وانا قاطعوها يعني اليهود فهل عسيت ان نحن فعلنا ذلك ثم اظهرك الله ان ترجع الى قومك وتدعنا؟۔ (ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ۱/۴۰۲)

''یا رسول اللہ! ہمارے اور یہود کے مابین تعلقات ہیں جنھیں (آپ کا ساتھ دینے کے لیے) ہم توڑ دیں گے، لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ ہم یہ کر لیں اور پھر اللہ آپ کو (قریش پر) غلبہ عطا کر دے تو آپ ہمیں چھوڑ کر واپس اپنی قوم کے پاس چلے جائیں؟''

سفر ہجرت کے موقع پر سراقہ بن مالک نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر کا پیچھا کر کے انھیں گرفتار کرنے کی کوشش کی، لیکن قریب پہنچنے پر ان کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے اور وہ اپنی کوشش میں ناکام رہے۔ اس پر انھیں یقین ہو گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غلبہ پا کر رہیں گے:

فعرفت حين رايت ذلك انه قد منع مني وانه ظاهر۔ (السیرۃ النبویہ ۱/۴۴۲)

''یہ دیکھ کر میں نے جان لیا کہ آپ کو مجھ سے محفوظ کر دیا گیا ہے اور یہ کہ آپ غالب ہو کر رہیں گے۔''

سراقہ نے آپ سے درخواست کی کہ آپ کو امان نامہ لکھ دیا جائے جو آپ نے قبول فرما لی۔ فتح مکہ کے موقع پر

سراقہ یہی امان نامہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر اسلام قبول کر لیا۔

مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے بعد جب اہل ایمان کو قتال کا حکم دے دیا گیا تو انھیں بشارت دی گئی کہ مسلمانوں کو اس جنگ میں خدا کی تائید حاصل ہے، اس لیے وہ کمزوری دکھاتے ہوئے از خود دشمن کے ساتھ صلح کی خواہش کا اظہار نہ کریں:

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ۔ (محمد ۴۷: ۳۵)

''سو تم کمزوری دکھا کر صلح کی دعوت نہ دو جبکہ بہر حال تم ہی غالب رہو گے۔ اور اللہ تمھارے ساتھ ہے اور وہ تمھارے اعمال کا بدلہ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گا۔''

سورۂ بقرہ کی آیات ۱۹۲، ۱۹۳ میں بھی قریش کے خلاف قتال کا حکم ایسے اسلوب میں دیا گیا ہے کہ گویا اس کے نتیجے میں قریش کے برپا کردہ فتنے کا خاتمہ اور اللہ کا دین کا غلبہ ایک قضائے مبرم ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (البقرہ ۲: ۱۹۳)

''اور ان کے ساتھ جنگ کرو یہاں تک فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔''

یہی اعلان مختلف اسالیب میں قرآن میں جگہ جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ سورۂ صف میں ارشاد ہوا ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔ (الصّف ۶۱: ۹)

''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کر دے، چاہے مشرک اس بات کو کتنا ہی ناپسند کرتے رہیں۔''

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ۔ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ۔ (المجادلہ ۵۸: ۲۰، ۲۱)

''بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف برسر پیکار ہیں، وہی ذلیل ہو کر رہیں گے۔ اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ہر حال میں غالب آئیں گے۔ بے شک اللہ بے حد قوت والا، غالب آنے والا ہے۔''

اہل کفر اور اہل ایمان کے مابین پہلا معرکہ بدر میں ہوا۔ اس جنگ میں قریش کی صف اول کی قیادت کو تہ تیغ کر کے نہ صرف قریش کو ان کے حتمی انجام کی تصویر دکھا دی گئی بلکہ رسول اللہ کے مخالف دوسرے گروہوں کو بھی اس سے عبرت حاصل کرنے کی نصیحت کی گئی۔ قرآن مجید نے اسی لیے غزوۂ بدر کو 'یوم الفرقان' یعنی حق و باطل کے مابین فیصلہ کن معرکے کا دن قرار دیا (الانفال ۸: ۴۱) اور کہا کہ منکرین حق کے تمام گروہ اس واقعے میں اپنے انجام کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ ارشاد ہے:

قُـل لِلَّذِيْنَ كَفَرُواْ سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَـى جَهَـنَّـمَ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ـ قَـدْ كَانَ لَـكُـمْ آيَةٌ فِـيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْـلِ الـلّـهِ وَأُخْـرَى كَـافِرَةٌ يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِـمْ رَأْيَ الْـعَيْـنِ وَاللّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَـن يَشَـاءُ إِنَّ فِـيْ ذَلِكَ لَـعِبْـرَةً لَّأُوْلِيْ الأَبْصَارِ ـ (آل عمران ۳: ۱۲، ۱۳)

''تم ان منکروں سے کہہ دو کہ عنقریب تم مغلوب کر دیے جاؤ گے اور تمھیں دھکیل کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ تمہارے لیے ان دو گروہوں میں جن کی آپس میں مڈبھیڑ ہوئی، عبرت کی ایک بڑی نشانی تھی۔ ایک گروہ تو مومن تھا) جو اللہ کے راستے میں لڑ رہا تھا جبکہ دوسرا کافر تھا جو طاغوت کے لیے برسر پیکار تھا، اور انھیں مسلمان اپنی آنکھوں سے اپنے سے دوگنا دکھائی دے رہے تھے۔ اور اللہ جس کی چاہے اپنی مدد سے تائید کرتا ہے۔ بے شک اس میں آنکھیں رکھنے والوں کے لیے عبرت کا بڑا سامان ہے۔''

تاریخ و سیرت بھی قرآن مجید کے اس بیان کی تائید کرتے ہیں۔ واقدی کا بیان ہے:

فلما قدم بالاسرى اذل الله بذلك رقاب المشركين والمنافقين واليهود ولم يبق بالمدينة يهودى ولا منافق الا خضع عنقه لوقعة بدر ..... وفرق الله فى صبحها بين الكفر والايمان وقالت اليهود فى ما بينها هو الذى نجده منعوتا والله لا تفرع له راية بعد اليوم الا ظهرت۔ (المغازی، ۱/۱۲۱)

''جب آپ قیدیوں کو گرفتار کر کے لائے تو اللہ نے اس کی وجہ سے مشرکوں اور منافقوں اور یہودیوں کے سرنگوں کر دیے اور مدینے میں کوئی یہودی یا منافق ایسا نہ رہا جس کی گردن واقعہ بدر کے بعد جھک نہ گئی ہو۔۔۔ اس روز اللہ نے کفر اور ایمان کے مابین امتیاز قائم کر دیا اور یہود آپس میں کہنے لگے کہ یہ وہی پیغمبر ہے جس کی صفات تمھاری کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ بخدا، آج کے بعد جب بھی جنگ کا علم لہرائے گا، غلبہ اسی کو نصیب ہوگا۔''

غزوۂ احد کے بعد مدینہ منورہ کے یہود اور منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے خلاف اعتراضات کیے تو سیدنا عمر نے آپ سے اجازت طلب کی کہ ان یہودیوں اور منافقوں کو قتل کر دیں۔ آپ نے فرمایا:

یا عمر ان الله مظهر دینه و معز نبیه و للیهود ذمة فلا اقتلهم۔ (المغازی، ۱/۳۱۸)

''اے عمر! اللہ یقیناً اپنے دین کو غالب اور اپنے نبی کو سرفراز کرے گا، لیکن یہود کے ساتھ ہمارا معاہدہ ہے اس لیے میں انھیں قتل نہیں کروں گا۔''

غزوۂ احد ہی کے موقع پر ابو سفیان نے جاتے ہوئے مسلمانوں کو آئندہ سال اسی وقت بدر الصفراء کے مقام پر آ کر لڑنے کا چیلنج دیا تھا۔ مقررہ وقت پر جب ابو سفیان کی پھیلائی ہوئی افواہوں کی وجہ سے مسلمانوں میں خوف کی کیفیت ہونے لگی اور اندیشہ ہوا کہ وہ لڑائی کے لیے نہیں نکلیں گے تو سیدنا ابو بکر اور سیدنا عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ:

یا رسول الله ان الله مظهر دینه و معز نبیه وقد وعدنا القوم موعدا و نحن لا نحب ان نتخلف عن القوم فیرون ان هذا جبن منا عنهم فسر لموعدهم۔ (المغازی، ۱/۳۸۷)

''یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو غالب اور اپنے نبی کو سرفراز کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ ہم نے اپنے دشمن کے ساتھ ایک وقت مقرر کیا تھا اور ہم اس کو پسند نہیں کرتے کہ لڑائی سے پیچھے ہٹیں اور دشمن یہ سمجھے کہ یہ ہماری بزدلی ہے، اس لیے آپ مقررہ مقام کی طرف روانہ ہو جائیے۔''

اس کے بعد مسلمانوں کی قوت اور اسلام کی دعوت میں مسلسل وسعت پیدا ہوتی رہی اور قریش کی رسوائی اور ہزیمت کا دائرہ بھی اسی تناسب سے پھیلتا رہا۔ صورت حال پر نظر رکھنے والے ذہین لوگوں کو فتح مکہ سے قبل ہی اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ آخر کار قریش پر غالب آ کر رہیں گے۔ چنانچہ ۵ ہجری میں غزوۂ احزاب کے موقع پر قریش نے پورے عرب سے قبائل کو جمع کر کے مدینہ پر حملے کا ارادہ کیا تو حارث بن عوف نے اپنے قبیلہ بنو غطفان کو اس مہم میں شریک ہونے سے منع کیا اور ان سے کہا:

تفرقوا فی بلادکم و لا تسیروا الی محمد فانی اری ان محمدا امره ظاهر لو ناواه من بین المشرق والمغرب لکانت له العاقبة ۔ (الواقدی، المغازی، ۲/۴۴۳)

''اپنے علاقے میں منتشر ہو جاؤ اور محمد پر حملے کے لیے مت جاؤ۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محمد کا دین غالب آ کر رہے گا۔ اگر مشرق سے مغرب تک سارے انسان اس کے مقابلے میں آ جائیں تو بھی فتح اسی کو حاصل ہوگی۔''

عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ وہ قریش کی طرف سے بدر، احد اور خندق میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد

انھیں قریش کی مغلوبیت کا یقین ہو گیا۔ کہتے ہیں:

فقلت فی نفسی کم اوضع؟ والله لیظهرن محمد علی قریش فخلفت مالی بالرهط وافلت یعنی من الناس فلم احضر الحدیبیة ولا صلحها۔ (المغازی،۲/۷۴۱،۷۴۲)

''میں نے اپنے جی میں کہا: میں کب تک اس لاحاصل تگ ودو میں شریک رہوں گا؟ بخدا، محمد کو قریش پر غلبہ حاصل ہو کر رہے گا۔ چنانچہ میں نے اپنا مال واسباب اپنے قبیلے ہی میں چھوڑا اور لوگوں سے پیچھا چھڑا کر نکل گیا۔ چنانچہ میں حدیبیہ کے معاہدہ صلح کے موقع پر موجود نہیں تھا۔''

عمرو اس کے بعد حبشہ چلے گئے۔ نجاشی شاہ حبشہ نے ایک موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کی تو عمرو قبول حق کی طرف متوجہ ہوئے۔ کہتے ہیں:

قلت فی نفسی عرف هذا الحق العرب والعجم وتخالف انت؟ قلت اتشهد ایها الملك بهذا؟ قال نعم اشهد به عند الله یا عمرو فاطعنی واتبعه والله انه لعلی الحق ولیظهرن علی کل دین خالفه کما ظهر موسی علی فرعون وجنوده۔ (المغازی، ۲/۷۴۳)

''میں نے اپنے دل میں کہا: ارے، اس حق کو تو عرب اور عجم کے لوگ پہچانتے ہیں اور تو ابھی تک مخالف ہے؟ میں نے بادشاہ سے پوچھا کہ کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو؟ اس نے کہا، اے عمرو، میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر یہ گواہی دیتا ہوں، اس لیے میری بات مان لو اور اس نبی کی اطاعت اختیار کر لو۔ بخدا وہ حق پر ہے اور اپنی مخالفت کرنے والے ہر دین پر اسی طرح غالب آ کر رہے گا جیسے موسیٰ کو فرعون اور اس کے لشکر کے مقابلے میں غلبہ حاصل ہوا تھا۔''

ہرقل کے نام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ مبارک پہنچنے پر اس نے ابوسفیان کو بلا کر ان سے گفتگو کی۔ اس گفتگو کے بعد ابوسفیان نے اپنے تاثرات یوں بیان کیے:

فلما ان خرجت مع اصحابی وخلوت بهم قلت لهم قد امر امر ابن ابی کبشة هذا ملك بنی الاصفر یخافه قال ابو سفیان والله ما زلت ذلیلا مستیقنا بان امره سیظهر حتی

''پھر جب میں اور میرے ساتھی اس کے دربار سے نکل کر تنہائی میں بیٹھے تو میں نے ان سے کہا: ابوکبشہ کے بیٹے کا معاملہ تو ہمارے بس سے باہر ہو گیا ہے۔ یہ دیکھو، رومیوں کا بادشاہ بھی اس سے خوف زدہ ہے۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ بخدا، اس وقت سے مجھے پکا

ادخل اللہ قلبی الاسلام وانا کارہ۔ (بخاری، رقم ۲۷۲۳)

یقین ہو گیا کہ محمد غالب آ کر رہیں گے، یہاں تک آخرکار اللہ نے میرے دل میں اسلام کو داخل کر دیا، حالانکہ میں اس کو ناپسند کرتا تھا۔''

خالد بن الولید کہتے ہیں:

لما اراد اللہ بی من الخیر ما اراد قذف فی قلبی حب الاسلام وحضرنی رشدی وقلت قد شہدت ہذہ المواطن کلہا علی محمد فلیس موطن اشہدہ الا انصرف وانا اری فی نفسی انی موضع فی غیر شئ وان محمد سیظہر۔ (المغازی، ۲/۷۴۶)

''جب اللہ نے میرے ساتھ بھلائی کا ارادہ کیا تو میرے دل میں اسلام کی محبت ڈال دی اور مجھے ہدایت کی بات سوجھ گئی۔ میں نے کہا: میں محمد کے خلاف ان تمام جنگوں میں شریک رہا ہوں اور کوئی جنگ ایسی نہیں ہوتی کہ جس میں شریک ہونے کے بعد میں پلٹوں اور میرے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ میں ایک بے فائدہ جدوجہد میں مصروف ہوں اور محمد بہرحال غالب آ کر رہیں گے۔''

فتح مکہ کے بعد بنو ہوازن اور بنو ثقیف نے مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس موقع پر بنو ہوازن میں سے دو قبیلے بنو کعب اور بنو کلاب ان کے ساتھ شریک نہ ہوئے۔ ان میں سے ایک سردار ابن ابی البراء نے بنو کلاب کو اس جنگ میں شریک ہونے سے منع کیا اور ان سے کہا کہ:

واللہ لو ناوا محمدا من بین المشرق والمغرب لظہر علیہ۔ (المغازی، ۳/۸۸۶)

''بخدا، اگر مشرق سے مغرب تک سب لوگ محمد کے مقابلے میں آ جائیں، تب بھی محمد ہی غالب رہیں گے۔''

غزوۂ حنین کے موقع پر جب دوران سفر میں ایک مشرک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سویا ہوا پا کر آپ پر تلوار سونت لی۔ اس موقع پر آپ نے اس شخص کو معاف کر دیا اور ابو بردہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

ان اللہ مانعی وحافظی حتی یظہر دینہ علی الدین کلہ۔ (المغازی، ۳/۸۹۲)

''بے شک اللہ میری حفاظت کرے گا، یہاں تک کہ اپنے دین کو تمام دینوں پر غالب کر دے۔''

غزوۂ حنین میں شکست کی کیفیت کو خود بنو ثقیف کے بعض لوگوں نے یوں بیان کیا:

فتفرقت جماعتنا فی کل وجہ وجعلت الرعدۃ تسحقنا حتی لحقنا

''ہمارا لشکر تمام اطراف میں تتر بتر ہو گیا اور کپکپی ہم پر اس طرح طاری ہوئی کہ کسی کام کا نہ چھوڑا۔ آخرکار ہم

بعلیاء بلادنا فان کان لیحکی عنا الکلام ما کنا ندری به مما کان بنا من الرعب فقذف الله الاسلام فی قلوبنا۔ (المغازی ۳/۹۰۷)

گرتے پڑتے اپنے علاقے کی سخت اور سنگین زمین تک پہنچ گئے۔ لوگ ہمیں وہ باتیں بتاتے تھے جو اس موقع پر ہمارے مونہوں سے نکلیں لیکن رعب اور ہیبت کی وجہ ہمیں خود کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہم کیا بول رہے ہیں۔ اس کے بعد اللہ نے ہمارے دلوں میں اسلام قبول کرنے کا خیال ڈال دیا۔''

مسلمانوں کے غلبہ اور قریش کی ہزیمت کا یہ عمل فتح مکہ کی صورت میں اپنے نقطہ کمال کو پہنچا اور قریش کے اس انجام نے تر دد اور شکوک وشبہات کی اس کیفیت کا بالکل خاتمہ کر دیا جس میں جزیرۂ عرب کے اکثر قبائل اس سے پہلے مبتلا تھے۔ چنانچہ پورے عرب نے آپ کے سامنے تسلیم وانقیاد کی گردن جھکا دی۔ عمرو بن سلمہ بتاتے ہیں:

کانت العرب تلوم باسلامهم الفتح فیقولون اترکوه وقومه فان ان ظهر علیهم فهو نبی صادق فلما کانت وقعة اهل الفتح بادر کل قوم باسلامهم۔ (بخاری، رقم ۳۹۶۳)

''اہل عرب اسلام لانے کے لیے فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ محمد اور ان کے قبیلے کے مابین فیصلہ ہو لینے دو۔ اگر محمد غالب آ گئے تو وہ سچے نبی ہیں۔ پھر جب مکہ فتح ہو گیا تو ہر قبیلہ اسلام قبول کرنے کے لیے لپکنے لگا۔''

ابن اسحاق کا بیان ہے:

وانما کانت العرب تربص باسلامها امر هذا الحی من قریش لان قریشا کانوا امام الناس وهادیهم واهل البیت والحرم وصریح ولد اسماعیل بن ابراهیم وقادة العرب لا ینکرون ذلك وکانت قریش هی التی نصبت الحرب لرسول الله صلی الله فلما افتتحت مکة ودانت له قریش ودوخها الاسلام عرفت العرب انه لا طاقة لهم بحرب رسول

''سارا عرب اسلام قبول کرنے کے لیے قریش کا انجام طے ہونے کا انتظار کر رہا تھا، کیونکہ قریش لوگوں کے پیشوا اور رہنما، حرم اور بیت اللہ کے متولی اور اسماعیل علیہ السلام کی خالص نسل سے تھے اور عرب کی قیادت کے منصب پر فائز تھے جس کو کوئی چیلنج کرنے والا نہیں تھا۔ اور یہ قریش ہی تھے جو حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف برسرپیکار تھے۔ پھر جب مکہ فتح ہو گیا اور اسلام نے قریش کو زیر کر کے اپنا مطیع بنا لیا تو اہل عرب جان گئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ اور دشمنی کا خطرہ مول نہیں لے سکتے، چنانچہ

الـله صلى الله عليه و سلم و لا عداوته فـدخـلوا فى دين الله كما قال الله عز وجـل افـواجـا يـضـربون اليه من كل وجه ۔ (ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ ۴/۷۶)	اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق وہ ہر جانب سے آپ کے پاس حاضر ہوئے اور گروہ در گروہ اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے۔''

اس پوری داستان سے، ظاہر ہے کہ اردگرد کی اقوام بے خبر نہیں تھیں، چنانچہ جزیرۂ عرب میں اسلام کے غالب ہونے کے نتیجے میں اسلام کی حقانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعواے نبوت کی صداقت ان اقوام پر بھی پوری طرح واضح ہوگئی۔ ابن سعد کی 'الطبقات الکبریٰ' (۱/ ۲۵۸-۲۶۳) اور دیگر تاریخی مآخذ میں درج تفصیلات کے اس کی مختصر روداد حسب ذیل ہے:

عمرو بن امیۃ الضمری کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی شاہ حبشہ کے نام دعوت اسلام کا خط دے کر بھیجا۔ اس نے آپ کے خط کو آنکھوں سے لگایا، تخت سے اتر کر نہایت تواضع کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ پھر اس نے اپنے قبول اسلام کی باقاعدہ تحریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لکھی اور کہا کہ اگر میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوسکتا تو ہو جاتا۔

دحیہ کلبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک لے کر قیصر روم کے پاس گئے تو اس نے علامات کو پہچان کر نہ صرف خود آپ کی نبوت کی تصدیق کی بلکہ اپنی قوم کو بھی آپ پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ لیکن مسیحی علما اور سرداروں کی جانب سے شدید ردعمل دیکھ کر اسے خوف ہوا کہ وہ اس بات پر وہ خود قیصر کی اطاعت قبول کرنے سے بھی انکار کر دیں گے، چنانچہ اس نے اپنی بادشاہت کو بچانے کی خاطر اسلام قبول کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس موقع پر قیصر نے ابوسفیان کو بلا کر، جو اتفاق سے اس وقت شام میں موجود تھے، آپ کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ان معلومات کی روشنی میں اس نے یہ پیش گوئی کی کہ يوشك ان يملك موضع قدمي هاتين (بخاری، رقم ۲۷۲۳) یعنی عنقریب یہ علاقہ بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضے میں ہوگا جو اس وقت میرے زیر نگیں ہے۔

طب بن ابی بلتعہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقوقس شاہ مصر کے نام مکتوب مبارک دے کر بھیجا۔ اس نے خط پڑھ کر اچھے کلمات کہے اور نہایت ادب اور احترام سے آپ کے خط کو محفوظ کر لیا۔ اس نے دو نہایت قیمتی لونڈیاں اور ایک سفید گدھا تحفے کے طور پر آپ کی خدمت میں بھیجے اور جوابی خط میں لکھا کہ یہ بات تو میرے علم میں تھی کہ ایک نبی نے مبعوث ہونا ہے، البتہ میرا گمان یہ تھا کہ شاید وہ شام میں مبعوث ہوگا۔ تاہم اس نے آپ کی طرف سے قبول

اسلام کی دعوت کے جواب میں یہ عذر پیش کیا کہ قبطی قوم اس معاملے میں میری بات نہیں مانے گی۔ اس نے پیش گوئی کی کہ:

وسیظھر علی البلاد وینزل اصحابه من بعده بساحتنا هذه حتی یظهروا علی ما ھھنا ۔ (الاصابۃ، ۴/۱۹۶۷)

''انھیں ملکوں پر غلبہ نصیب ہوگا اور ان کے بعد ان کے ساتھی ہمارے اس علاقے میں آئیں گے یہاں تک کہ یہاں بھی ان کا غلبہ قائم ہو جائے گا۔''

اس نے مزید کہا:

وستکون له العاقبة حتی لا ینازعه احد ویظهر دینه الی منتهی الخف والحافر۔ (الاصابہ، ۴/۱۹۶۸)

''انجام کار سرفرازی انھی کا مقدر ہے یہاں تک کہ کوئی ان کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھے گا اور جہاں تک گھوڑے اور اونٹ پہنچ سکتے ہیں، وہاں تک ان کا دین غالب ہوگا۔''

عبداللہ بن حذافہ سہمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط لے کر خسرو شاہ ایران کے پاس گئے۔ اس نے نہایت تکبر کے ساتھ آپ کا والا نامہ پھاڑ دیا اور یمن میں اپنے گورنر باذان کو لکھا کہ دو آدمی بھیج کر اس مدعی نبوت کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ باذان کے قاصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ نے ان سے کہا کہ ایک دن ٹھہر جاؤ اور کل دوبارہ میرے پاس آنا۔ اگلے دن وہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اطلاع دی کہ میرے رب نے گزشتہ رات تمھارے آقا کو خود اس کے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل کروا دیا ہے۔ قاصد یہ اطلاع لے کر یمن واپس گئے تو باذان اور اس کے ماتحت عرب فارسی نسل کے لوگوں نے صورت حال کی تصدیق کرنے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔

(باقی)

محمد عمار خان ناصر

''نقد فراہی''

مصنف : ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی

ضخامت : ۲۱۶

قیمت : ۱۰۰

ناشر : مکتبہ اسلام، نشیمن مارکیٹ، میڈیکل کالج روڈ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲

مولانا حمید الدین فراہیؒ کا نام گرامی برصغیر کے علمی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ قرآن مجید کے فہم وتدبر کے باب میں مجتہدانہ انداز فکر کی بدولت مولانا علیہ الرحمۃ کی ایک امتیازی شان ہے اور اہل علم کا ایک مستقل حلقہ مولانا کے علمی وتحقیقی کام کے زیر اثر انھی کے منہج پر قرآنی علوم ومعارف کی خدمت کا تسلسل قائم رکھے ہوئے ہے۔ مولانا فراہی کی بلند پایہ تحقیقات کو جہاں اہل علم کے ہاں غیر معمولی پذیرائی ملی، وہیں قدرتی طور پر ان کی بعض منفرد اور اچھوتی آرا نقد وجرح کا موضوع بھی بنیں، بلکہ ان میں سے بعض تو اہل علم کے مابین معرکہ آرا بحثوں کا عنوان بھی بن گئیں۔ ایسی کم وبیش سبھی آرا کے پس منظر میں یہ اصولی بحث کارفرما ہے کہ تفسیر وحدیث کے ذخیرے میں موجود ان روایات کا علمی درجہ اور ان سے استفادہ کا صحیح منہج کیا ہے جو قرآن مجید کی آیات کے مطالب یا ان کے پس منظر پر مختلف حوالوں سے روشنی ڈالتی ہیں۔ مولانا فراہی کے منہج فکر میں ایسی روایات تفسیر کے ماخذ کے طور پر بنیادی نہیں، بلکہ ثانوی درجہ رکھتی ہیں اور انھیں قبول کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خود قرآن کے داخلی نظام اور متن کی اندرونی دلالتوں کی حاکمیت ان پر قائم رکھی جائے، چنانچہ انھوں نے اپنے فہم کے مطابق اس معیار پر پورا نہ اترنے والی متعدد تفسیری روایات کو جو اس سے پہلے عام طور پر مستند سمجھی جاتی تھیں، قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ان پر شدید تنقید کی۔

ظاہر ہے کہ اس پر علمی بحث ومناقشہ کا سلسلہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔

زیرنظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔اس کے مصنف ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی بھارت کی معروف علمی شخصیت ہیں جو متنوع علمی موضوعات پر پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ مشہور تحقیقی جریدے ''تحقیقات اسلامی'' کی ادارت کی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں۔زیرنظر کتاب ان کے پانچ علمی مقالات کا مجموعہ ہے جو مولانا فراہی کے تفسیری منہج اور بعض تفسیری آرا کے تجزیہ وتنقید کے ضمن میں مختلف اوقات میں تحریر کیے گئے اور مختلف علمی جرائد میں شائع ہوتے رہے۔اب انھیں افادۂ عام کی خاطر زیرنظر مجموعے میں یکجا کر دیا گیا ہے۔

پہلا مقالہ ''تفسیر سورۃ الفیل'' کے عنوان سے ہے اور اس میں سورۂ فیل کی تفسیر کے ضمن میں مولانا فراہی کی اس معروف رائے کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے جس کی رو سے ابرہہ کے لشکر پر سنگ باری اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پرندوں نے نہیں بلکہ اہل مکہ نے کی تھی اور اللہ نے تیز وتند ہوا بھیج کر اس سنگ باری میں ایسی طاقت پیدا کر دی تھی جس سے ابرہہ کا پورا لشکر تہس نہس ہو کر رہ گیا۔مولانا کی رائے میں سورۂ فیل میں جن پرندوں کا ذکر ہوا ہے، وہ مردار خور پرندے تھے جو سنگ باری کے لیے نہیں بلکہ ابرہہ کے لشکر کی لاشوں کو نوچنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔فاضل مصنف نے اس ضمن میں مولانا اور ان کے علمی مویدین کی طرف سے قرآن کے متن اور تاریخی روایات واشعار کے حوالے سے پیش کردہ دلائل وقرائن کا مفصل ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ واقعۂ فیل کی عملی تفصیلات کے حوالے سے عام مفسرین کی رائے ہی درست اور راجح ہے۔

راقم کی نظر میں فاضل مصنف کا اخذ کردہ نتیجہ درست ہے، البتہ دوسرے ناقدین کی طرح انھوں نے بھی زیادہ توجہ مولانا فراہی اور ان کے مویدین کے پیش کردہ تاریخی قرائن وشواہد اور قیاسات پر مرکوز رکھی ہے جس سے خود قرآن کی زبان، اسلوب اور داخلی قرائن کی روشنی میں اس نقطۂ نظر کی کمزوری واضح کرنے کا پہلو دب گیا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ مولانا کا زیر بحث نقطۂ نظر خود ان کے اپنے تفسیری منہج سے ہٹا ہوا ہے، کیونکہ اس پوری بحث کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ سورۂ فیل میں 'ترمیھم' کا فعل پرندوں کے لیے استعمال ہوا ہے یا اہل مکہ کے لیے۔عام مفسرین اس کا فاعل 'طیرا' کو قرار دیتے ہیں جبکہ مولانا فراہی کی رائے میں یہ مخاطب کا صیغہ ہے جس کا فاعل قریش ہیں۔تاہم خود مولانا کے تفسیری اصول کے مطابق تفسیری وتاریخی روایات اور کسی بھی قسم کے خارجی قیاسات سے خالی الذہن ہو کر قرآن کے نفس متن کو پڑھا جائے تو 'وارسل علیھم طیرا ابابیل ترمیھم بحجارۃ من سجیل' کا بے تکلف اور متبادر مفہوم یہی بنتا ہے کہ رمی کو طیر سے متعلق قرار دیا جائے۔کلام کو اس کے بالکل متبادر مفہوم پر محمول کرنا، جب تک کہ اس

کے خلاف خود کلام میں کوئی داخلی قرینہ نہ ہو، مولانا کا بلکہ تمام مفسرین کا مسلمہ اصول ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں وہ کون سا قرینہ صارفہ ہے جو 'ترمی' کو 'طیرا' کے ساتھ متعلق ہونے سے روکتا ہے؟ مولانا اصلاحی نے اس کے جواب میں یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ ''فعل 'ترمی'، چڑیوں کے لیے کسی طرح موزوں ہے ہی نہیں۔ چڑیاں اپنی چونچوں اور چنگلوں سے سنگ ریزے تو گرا سکتی ہیں، لیکن اس کو رمی نہیں کہہ سکتے''، لیکن یہ ایک کمزور بات ہے، کیونکہ عربی زبان میں کسی فعل کے لیے اس کے نتیجے کے لحاظ سے لفظ استعمال کرنا ایک عام اسلوب ہے۔ پرندوں کا پتھر گرانا فی نفسہ یقیناً 'رمی' نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ تیز و تند ہوا بھیج کر اس سے وہی کام لے لیا جو رمی سے لیا جاتا ہے، چنانچہ اس کے لیے لفظ 'رمی' کا استعمال ہر اعتبار سے اسالیب زبان کے مطابق بلکہ بلاغت کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ راقم الحروف نے یہ اعتراض ایک موقع پر استاذ گرامی جاوید احمد صاحب غامدی کی خدمت میں عرض کیا تو انھوں نے فرمایا کہ لفظ 'رمی' کے پرندوں کے لیے ناموزوں ہونے کا نکتہ بنیادی استدلال نہیں بلکہ بہت سے دوسرے قرائن کے ضمن میں ایک تائیدی نکتہ ہے۔ یہ بات درست ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی درست ہے کہ اس نکتے کے علاوہ خود کلام میں داخلی طور پر اور کوئی قرینہ ایسا نہیں ہے جو 'ترمی' کو 'طیرا' سے متعلق ماننے سے روکتا ہو۔

پھر یہ کہ 'ترمی' کو مخاطب کا صیغہ مان کر قرآن کے مخاطب اہل مکہ کو اس کا فاعل قرار دینا بھی بالکل تکلف لگتا ہے۔ اسے 'ارایت' اور 'الم تر' کے اسلوب پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے لفظ رؤیت اس کا پوری طرح متحمل ہے کہ اس کی نسبت کلام کے ہر مخاطب اور سامع کی طرف کر دی جائے، جبکہ فعل 'رمی' کی نوعیت یہ نہیں ہے۔ اسی طرح اسے 'تقتلون انبیاء اللہ' جیسی مثالوں پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا جہاں عہد نبوی کے یہود کی طرف صدیوں پہلے ان کے آبا و اجداد کے ارتکاب کردہ جرم کی نسبت کی گئی ہے، کیونکہ اس اسلوب میں کسی گروہ کو بحیثیت گروہ مخاطب بنایا جاتا ہے اور اس کے لیے جمع کا صیغہ لایا جاتا ہے نہ کہ واحد کا، چنانچہ اگر سورۂ فیل میں یہ اسلوب اختیار کرنا پیش نظر ہوتا تو 'ترمیھم' کے بجائے 'ترمونھم' کا صیغہ استعمال کیا جاتا۔ خلاصہ یہ کہ عام مفسرین کی اختیار کردہ رائے کلام سے بالکل متبادر طور پر مفہوم ہے اور اس کے خلاف کوئی قرینہ صارفہ موجود نہیں، جبکہ مولانا فراہی کی تاویل کی صورت میں کلام میں ایک ایسا اسلوب فرض کرنا پڑتا ہے جو غیر معروف اور غیر مانوس ہے اور بعض ملتے جلتے اسالیب پر قیاس کے علاوہ بعینہٖ اس اسلوب کی کوئی نظیر کم از کم قرآن میں موجود نہیں۔ ان نکات کی روشنی میں، راقم کے نزدیک مولانا فراہی کی زیر بحث تاویل خود ان کے اپنے تفسیری اصول سے متجاوز قرار پاتی ہے۔

بہر حال مصنف نے متعدد پہلوؤں سے اس رائے پر عمدہ علمی نقد کیا ہے، لیکن توازن کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض

ناقدین کی طرح مولانا کی اس رائے کے ڈانڈے انکار معجزات یا نیچریت کے ساتھ ملانے کے بجائے (جس کا کوئی جواز اس لیے نہیں کہ مولانا کی بیان کردہ صورت یعنی اہل مکہ کی سنگ باری سے اصحاب فیل کے تہس نہس ہو جانے میں بھی معجزے کا پہلو پوری طرح پایا جاتا ہے) اس کے وجود میں آنے کا سبب یہ متعین کیا ہے کہ ''اشعار عرب کے وسیع وعمیق مطالعہ کے نتیجہ میں مولانا کے ذہن میں عربوں کی اخلاقی عظمت، شجاعت و بہادری، شہ سواری اور شمشیر زنی کی تصویر مرتسم ہو گئی تھی، اس لیے ان کو شبہ ہوا کہ انھوں نے لشکر ابرہہ سے ضرور مقابلہ آرائی کی ہوگی۔'' (ص ۴۲)

''تفسیری روایات'' کے زیر عنوان دوسرے مقالے میں تفسیری روایات سے متعلق مولانا فراہی کے زاویہ نظر کو موضوع بنایا گیا ہے اور ان کے اصولی مسلک کے علاوہ تفسیری روایات کی تنقید کے مختلف پہلو بھی مثالوں کے ساتھ واضح کیے گئے ہیں۔ مصنف نے بتایا ہے کہ مولانا کے ہاں بعض روایات سے غلط استشہاد کی مثالیں موجود ہیں۔ اسی طرح مولانا نے اپنے زاویہ نگاہ کے تحت بہت سی صحیح روایات کو رد جبکہ بعض ضعیف روایات کو قبول کیا ہے۔ مصنف نے اپنی تحقیق کا حاصل یہ بتایا ہے کہ ''تفسیر قرآن میں تفسیری روایات جتنی اہمیت کی مستحق تھیں، مولانا فراہیؒ نے انھیں اتنی اہمیت نہیں دی ہے۔'' راقم کی رائے میں تفسیری روایات اور خاص طور پر شان نزول کی روایات کو، چاہے ان کی سند صحیح ہو، زیادہ اہمیت نہ دینے کے معاملے میں مولانا فراہی اصولی طور پر منفرد نہیں ہیں۔ یہ مسلک تفسیر بالماثور کے منہج کے مطابق اگرچہ نہیں، لیکن ایک مستقل تفسیری مسلک کے طور پر اکابر مفسرین کے ہاں اس کی نمائندگی ملتی ہے۔ البتہ اس معاملے میں یقیناً مولانا فراہی سے اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ جن مخصوص روایات کو انھوں نے رد کیا ہے، وہ فی الواقع قرآن کی داخلی دلالتوں کے منافی ہیں بھی یا نہیں۔

''حدیث فہمی'' کے عنوان سے تیسرے مقالے میں مولانا فراہی کے ہاں حدیث کے فہم اور اس سے علمی استفادہ کے متنوع پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، جبکہ ''کچھ احادیث سے غلط استدلال'' اور ''کچھ احادیث کی صحت سے انکار'' کے ذیلی عنوانات کے تحت بعض آرا پر تنقید بھی کی گئی ہے۔ اسی مقالے میں 'ویعلمهم الكتب والحكمة' کی تفسیر میں مولانا فراہی کی اس رائے پر بھی تنقید کی گئی ہے کہ یہاں 'الکتاب' سے مراد قرآن اور 'الحکمۃ' سے مراد سنت نہیں، بلکہ 'الکتاب' سے مراد قرآن مجید میں بیان کیے جانے والے احکام وقوانین جبکہ 'الحکمۃ' سے مراد عقائد، اخلاق فاضلہ اور حکمت شریعت ہے، گویا یہ دو الفاظ قرآن مجید ہی کے دو مختلف پہلو رکھنے والے مضامین کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ مولانا نے اپنی اس رائے کے تفصیلی دلائل اپنی کتاب ''مفردات القرآن'' میں بیان کیے ہیں، تاہم مصنف کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ یہاں مصنف کی تنقید سرسری اور غیر اطمینان بخش محسوس ہوتی ہے اور دیگر نکات کے علاوہ

مولانا فراہی کا یہ نکتہ بے حد قابل غور دکھائی دیتا ہے کہ حدیث وسنت میں حکمت پائے جانے کے باوجود اس کے لیے خاص طور پر 'الحکمۃ' کا عنوان اختیار کرنا اس لیے موزوں نہیں کہ اس میں قوانین اور احکام بھی بکثرت موجود ہیں۔ راقم کا طالب علمانہ رجحان یہ ہے کہ 'یتلوا علیھم آیاتہ' کے بعد 'ویعلمھم الکتب والحکمۃ' کو قرآن کے مضامین کے ساتھ مخصوص ماننے یا 'الحکمۃ' کا مصداق خاص طور پر سنت کو قرار دینے کے بجائے ان دونوں الفاظ کو عموم پر رکھتے ہوئے 'الکتاب' سے احکام وقوانین جبکہ 'الحکمۃ' سے عقائد واخلاق وغیرہ مراد لینا زیادہ موزوں ہے، خواہ یہ قرآن میں وارد ہوئے ہوں یا حدیث وسنت میں، کیونکہ آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کار منصبی کی وضاحت کی گئی ہے اور آپ نے احکام شریعت اور حکمت دین کی تعلیم امت کو قرآن کی صورت میں بھی دی ہے اور سنت اور حدیث کی صورت میں بھی۔

چوتھے مقالے میں مصنف نے مولانا فراہی کی ایک نا تمام اور غیر مطبوعہ تصنیف ''احکام الاصول باحکام الرسول'' کے بعض اقتباسات کا ترجمہ پیش کیا ہے جو ڈاکٹر معین الدین اعظمی کے پی ایچ ڈی کے مقالے ''الفراہی واثرہ فی تفسیر القرآن'' سے ماخوذ ہیں۔ مولانا نے اس کتاب میں حدیث اور قرآن کے باہمی تعلق کے مختلف پہلوؤں پر اپنے اصولی نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے اور احادیث کے ذریعے قرآن میں نسخ یا تخصیص کے نظریے کی تردید کرتے ہوئے ایسے تمام احکام کو قرآن مجید پر مبنی اور ان سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ اسی کتاب میں مولانا نے زانی کے لیے سزاے رجم کے قرآن کی آیت محاربہ پر مبنی ہونے کی وہ مشہور رائے ظاہر کی ہے جسے بعد میں مولانا امین احسن اصلاحی نے زیادہ شرح وبسط کے ساتھ ''تدبر قرآن'' میں پیش کیا اور جو ایک زوردار علمی مباحثے کا عنوان بنی رہی۔ مصنف نے اس مختصر مقالے میں مولانا کی ان آرا پر کوئی تعلیق یا تبصرہ کرنے کے بجائے صرف اقتباسات کا ترجمہ کرنے پر اکتفا کی ہے۔

کتاب کا آخری مقالہ ''مناسک حج کی تاریخ'' کے زیر عنوان ہے اور اس میں صفا ومروہ کی سعی، رمی جمار اور سیدنا اسماعیل کو ذبح کرنے کے حوالے سے حضرت ابراہیم کے خواب سے متعلق مولانا فراہی کی مخصوص آرا کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی بعض مرفوع روایات کی بنیاد پر عام رائے یہ ہے کہ صفا ومروہ کے مابین سعی حضرت ہاجرہ کی اس بھاگ دوڑ کی یاد میں کی جاتی ہے جو انھوں نے سیدنا اسماعیل کے لیے پانی کی تلاش میں کی جبکہ جمرات پر کنکر مارنا حضرت ابراہیم کے شیطان کو پتھر مارنے کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ مولانا فراہی نے ان روایات پر تنقید کرتے ہوئے متبادل توجیہ یہ پیش کی ہے کہ صفا ومروہ کی سعی کی رسم دراصل حضرات ابراہیم کی اس دوڑ دھوپ کی

علامت ہے جو انھوں نے راہ خدا میں کی جبکہ جمرات کی رمی شیطان کے بجائے ابرہہ کے لشکر پر اہل مکہ کی طرف سے کی جانے والی سنگ باری کی یادگار ہے۔ اسی طرح ان کے خیال میں حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے سے متعلق جو خواب دیکھا، وہ ایک تمثیلی خواب تھا اور اس میں انھیں بیٹے کو حقیقتاً ذبح کرنے کا نہیں بلکہ راہ خدا میں نذر کر دینے اور خدا کے گھر کی خدمت کے لیے وقف کر دینے کا حکم ہوا تھا جسے انھوں نے ظاہری اور لفظی مفہوم میں لے کر اس پر عمل کرنا چاہا۔ مولانا فراہی کی مذکورہ آرا کی تائید مولانا شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کے ہاں بھی ملتی ہے۔ مصنف نے ان آرا پر نقد کرتے ہوئے نہایت قابل غور علمی سوالات اٹھائے ہیں اور مقبول عام موقف کی عمدہ اور مضبوط ترجمانی کی ہے۔ (رؤیائے ابراہیمی کے مفہوم و مطلب کے حوالے سے مذکورہ رائے کی تنقید میں جناب مولانا ارشادالحق اثری نے بھی ایک فاضلانہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے جو چند ماہ قبل ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور میں قسط وار شائع ہوا ہے۔)

۲۱۶ صفحات کے مختصر حجم پر مشتمل یہ کتاب عمدہ علمی نکات اور قابل مطالعہ مواد پر مشتمل ہے جس سے قرآنی علوم کے شائقین کو ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔ مصنف کا تنقیدی اسلوب علمی، مدلل اور سلجھا ہوا بھی ہے اور متعلقہ علمی مباحث پر ان کی پختہ گرفت کا آئینہ دار بھی۔ البتہ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مولانا فراہی اور ان کے علمی کام کا اصل تعارف سورۂ فیل کی تفسیر یا مناسک حج وغیرہ سے متعلق ان کی منفرد آرا نہیں۔ ان کی مرجوح اور علمی طور پر کمزور آرا کو یقیناً نقد و جرح کا موضوع بننا چاہیے، لیکن اس کے ساتھ یہ توازن بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ مولانا قرآنی علوم و معارف کے ایک بلند پایہ محقق ہیں اور کئی پہلوؤں سے ان کے افادات و تحقیقات نے قرآن پر غور و فکر کے بالکل نئے باب وا کیے ہیں۔ فاضل مصنف نے اسی تناظر میں کتاب کے ''پیش لفظ'' میں یہ برمحل وضاحت کی ہے کہ: ''وہ شخص بڑا نادان ہوگا جو ان سے یہ تاثر قائم کرے کہ ان میں مولانا فراہیؒ کی تنقیص اور ان کی عظمت کو داغ دار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان مقالات سے ان کی عظمت پر کوئی حرف آنے والا نہیں ہے۔ انھوں نے تدبر قرآن کی جو جوت جگائی ہے اور قرآن کریم کو تمام علوم میں مرکزی مقام دینے کی جو تحریک برپا کی ہے، اس کی بنا پر وہ بجا طور پر عہد حاضر کے امام قرار پاتے ہیں۔'' (ص۱۲)

کتاب عمدہ کاغذ پر معیاری انداز میں طبع کی گئی ہے۔
